راکھ سے لکھی گئی کتاب
ناصر عباس نیّر

راکھ سے لکھی گئی کتاب

افسانے

ناصر عباس نیّر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

891.4393 Nayyer, Nasir Abbas
Raakh Se Likhi Gai Kitaab/ Nasir Abbas Nayyer.-Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2018.
160pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2018ء
افضال احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-3165-5
ISBN-13: 978-969-35-3165-7

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
http://www.sangemeel.com e-mail: smp@sangemeel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

دنیا کی سب ماؤں کے نام

آرٹ کے ذمے کایا پلٹ دینا ہے، ہر اس بات، شے، واقعے کی جو ہمیں کسی بھی صورت میں پیش آ رہا ہے، حقیقی طور پر یا تخیلی طور پر۔ کایا پلٹ کا عمل کسی علامت میں ظاہر ہو سکتا ہے اور (پیش آنے والے واقعات کو) موسیقی میں ڈھال دینے کی صورت میں۔ یہ دوسرا عمل زیادہ تر شاعری میں ہوتا ہے، مگر فکشن میں بھی ایک اور طرح کی موسیقی تخلیق ہو سکتی ہے۔ جب واقعے یا کردار کی نفسی صورتِ حال کا بیان، کائنات میں جاری اس آہنگ کو مس کرتا ہے، جسے انسانی روح ہی سننے کی مجاز ہے۔ آرٹ کی علامت اور موسیقی دونوں آدمی کی یادداشت میں ہمیشہ باقی رہنے والی چیزیں ہیں۔ جنھیں فنکار کا منصب نصیب ہوا ہے، ان کا یہ فرض ہے۔ اپنا فرض ادا کیے بغیر کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔

ماخوذ: بورخیس (۱۸۹۹ء---۱۹۸۶ء)

فہرست

درخت باتیں ہی نہیں کرتے...

میں نے نہیں سنیں، مگر مجھے یقین ہے کہ درخت باتیں کرتے ہیں۔ کچھ باتوں پر اس لیے یقین ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے کہی ہوتی ہیں، جن پر آپ کو یقین ہوتا ہے۔ درختوں کے پاس بھی زبان ہے؛ یہ بات میرے دادا نے کہی تھی جو میری پیدائش سے ایک سال پہلے گزر گئے تھے۔ مجھے ابا بتاتے ہیں کہ ان کے والد نے ان کی شادی پندرہ سال کی عمر میں اس لیے کر دی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ جس گھر میں بچے اور درخت نہ ہوں، اس گھر پر نحوست چھائی رہتی ہے۔ جب پانچ سال تک ابا کے یہاں اولاد نہیں ہوئی تو دادا ان کی دوسری شادی پر اصرار کرنے لگے۔ ابا نے کچھ پس و پیش کیا۔ خدا کا کرنا کیا ہوا کہ اگلے سال ہی بیٹی پیدا ہوئی۔ دادا بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے جس نے بیٹی دی ہے، وہ بیٹا بھی عطا کرے گا۔ وہ اپنے اس پوتے کے بارے میں ابا سے باتیں کرتے تھے، جس کے بارے میں انھیں یقین تھا کہ وہ چل پڑا ہے، بس گھر اور ان کی گود میں پہنچنے ہی والا ہے۔ ابا نے مجھے وہ ساری باتیں بتائی ہیں۔ ابا نے بتایا کہ دادا کہتے تھے میں موٹا ہوں گا۔ میری آنکھیں بھوری ہوں گی۔ میرا قد لمبا ہوگا۔ دادا کو یہ سب کیسے معلوم تھا، اس کا جواب مجھے ایک دن مل گیا۔ گھر میں دادا کی واحد بلیک اینڈ وائٹ فوٹو موجود ہے۔ اس میں دادا پورے قد سے موجود ہیں۔ وہ کسی سٹوڈیو میں بنوائی گئی تھی۔ وہ اس میں قدرے بھاری جسم کے اور لمبے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں کے بارے ابا نے بتایا ہے کہ وہ سیاہ تھیں۔ امی

اور ابا دونوں کی آنکھیں سیاہ ہیں۔ بس اسی سوال کا جواب نہیں ملا کہ انھیں کیسے اور کیوں یقین تھا کہ میری آنکھیں بھوری ہوں گی۔ ویسے میں چاہتا بھی نہیں ہوں کہ مجھے اس سوال کا جواب ملے۔ ورنہ کون سا سوال ایسا ہے جس کا جواب ہم اپنی منشا یا تسلی کے مطابق تلاش یا گھڑ نہ سکتے ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں ڈرتا ہوں۔ سوال کے جواب ملنے کی خوشی بس ایک لمحے کی ہوتی ہے، پھر خالی پن کا کبھی نہ گزرنے والا زمانہ ہوتا ہے۔ میں دادا کو اس خالی پن کے سپرد کرنے سے ڈرتا ہوں۔

میں یہاں آنے سے پہلے کہاں تھا؟ اس بارے میں اگر کوئی بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں تو صرف اتنی کہ دادا کے یقین میں تھا۔ ابا نے دادا کے بارے میں اتنا کچھ بتایا ہے کہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ میں نے انھیں دیکھا نہیں۔ ابا نے بتایا کہ وہ دوپہر تک زمینوں میں خود اپنی نگرانی میں کام کراتے۔ گھر آتے تو ہر درخت کے نیچے باری باری بیٹھا کرتے تھے۔ گھر میں چار درخت تھے۔ ٹاہلی، شرینہہ، کیکر اور شہتوت۔ شہتوت سے کبھی کبھی الرجی بھی انھیں ہو جایا کرتی تھی، مگر وہ اس کے نیچے چارپائی ڈلوا کر بیٹھا کرتے۔ ابا سے، اماں سے، دادی سے، چچا سے باتیں کرتے۔ ان کی باتوں میں دنیا جہان کی باتیں ہوتیں؛ رشتہ داروں کی، آس پاس کے زمین داروں کی زمینوں کی، فصلوں کی، کبھی کبھی مذہب اور سیاست پر بھی بات کر لیتے۔ ہر بار ان میں پرندوں اور درختوں کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ ان کے 'دنیا جہان' میں کتنا کچھ شامل تھا! وہ بتاتے کہ کب درختوں کے پتے گرتے ہیں، کب کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ اس وقت ان کو کتنا پانی دینا چاہیے۔ کب درختوں کو چھانگنا چاہیے اور کون سی شاخیں چھانگنی چاہییں۔ کس درخت پر کون سا پرندہ گھونسلا بناتا ہے اور کس پر محض وقت گزاری کے لیے اور شاید ہماری اور دوسرے پرندوں کی باتیں سننے، سنانے آتا ہے۔ کون سا پرندہ کب انڈے دیتا اور سیتا ہے۔ ابا، دادا کی یہ بات بھی بتاتے ہیں کہ جب پرندے اپنے اپنے رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں تو درخت ہی ان کے بچوں کی

حفاظت کرتے ہیں۔ یہی نہیں ننھے پرندوں سے باتیں بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ مسلسل چوں چوں چراچوں کرتے رہتے ہیں اور دشمنوں سے محفوظ بھی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ سب باتیں قصہ کہانی لگتی ہیں۔ دل چسپ اور کسی اور دنیا کی!

دادا کو اپنی زمینوں میں (جو ان کی سخت محنت کی کمائی کا نتیجہ تھیں) موجود سیکڑوں درختوں کے بارے میں سب معلوم رہتا۔ ابا بتاتے ہیں، انھوں نے صرف ایک بار پچاس کے قریب درخت بیچے تھے، جب گھر میں چار کمروں کا اضافہ کرنا تھا۔ کافی دنوں تک ان کے دل پر بوجھ رہا۔ ابا سے بار بار کہتے تھے، جو غلطی مجھ سے ہوئی تم کبھی نہ کرنا۔ درخت بیچنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنا بیٹا بیچے۔ کون اپنے بیٹوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے کٹتا دیکھ سکتا ہے۔ ابا یہ بھی بتاتے ہیں کہ انھیں شیشم کا وہ پرانا، بے حد گھنا درخت کبھی نہیں بھولا، جس پر چڑیوں، فاختاؤں، کووں، لالیوں کے بہ یک وقت آ ہلنے تھے۔ جب درخت کٹا ہے تو سب پرندے، بوکھلائے ہوئے، ایک عجب، نا قابل بیان بے چینی سے اڑتے ہوئے کبھی اس درخت کبھی اس درخت پر بیٹھتے، کبھی غول کی شکل میں اڑنے لگتے۔ وہ سب دل کو چیر ڈالنے والی آوازوں میں چیخ رہے تھے، جیسے کسی شخص کے سامنے اس کا پورا کنبہ ذبح کر دیا گیا ہو۔ دادا اس واقعے کو لوٹی کے ان دنوں سے جوڑتے، جب ان کی بستی میں ایک شام ہندوؤں اور سکھوں کو اچانک گھر بار چھوڑنے کا کہا گیا۔ وہ سب بھی اسی طرح بوکھلائے ہوئے تھے اور دل چیر دینے والی باتیں کر رہے تھے۔ ابا نے دادا کا وہ خواب بھی سنایا، جس میں انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک میدان میں اکیلے کھڑے ہیں، چاروں طرف بڑی بڑی چونچوں والے پرندے آسمان کی طرف فریادی نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں اور انھیں لگ رہا ہے کہ آسمان سے سیاہ آندھی زمین کی طرف امڈتی چلی آ رہی ہے۔ دادا نے کئی دن توبہ کرتے گزارے۔ پکھی واسوں کے ایک کنبے کو ایک کونے میں قیام کی مستقل اجازت دی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ دو تین ہفتوں بعد کوچ کر جاتے اور کچھ عرصہ بعد لوٹ آتے۔

ابا بتاتے ہیں کہ دادا کھانا شروع کرتے تو دو کام پہلے کرتے: درختوں کے چلھوں میں پانی ڈالتے اور پرندوں کو روٹی کے بھورے۔ وہ کہتے تھے کہ پرندے اور درخت دونوں ہمارے خاندان کا حصہ ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے تھے چڑیاں تو بالکل نئے نئے چلنے والے بچے کی طرح ہیں؛ ذرا نہیں ٹکتی کہیں۔ فاختہ اور کبوتروں کو دانش مند کہتے تھے۔ حضرت یوسف اور فاختہ کا قصہ بھی سناتے۔ یہ فاختہ ہی تھی جس نے 'گھوگھوگھوو، یوسف کھوہ' چیخ چیخ کر بتایا کہ اللہ کا نبی کنویں میں قید ہے۔ میں ابا کو چھیڑتا کہ کنعان میں جہاں حضرت یوسف قید ہوئے، وہاں پنجابی کا 'کھوہ' سمجھنے والا کوئی تھا تو وہ مجھے گھور کے دیکھتے اور کہتے، تم اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ پرندے صوفیہ کی طرح ہر علاقے کی زبان میں بات کرتے ہیں۔ میں سر کھجانے لگتا اور پھر چھیڑتا، فاختہ اب تک کیوں گھوگھوگھوو کیے جا رہی ہے۔ ابا کہتے، ابھی کئی یوسف اپنے اور دوسروں کے کھووں میں قید ہیں۔ دادا کی کوّوں کے بارے میں رائے اچھی نہیں تھی۔ کوّوں کو وہ ڈاکو کہتے تھے کہ بچوں سے نوالہ اور مرغیوں سے چوزے چھین کے لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بلا وجہ شور مچاتے ہیں۔ لیکن کہتے تھے کہ ڈاکو بھی ضروری ہیں۔ وہ ہمیں چوکنا رکھتے ہیں۔ ان ڈاکوؤں کی ایک اور خوبی بھی بیان کرتے کہ خاندان بنا کر رہتے ہیں۔ ایک کوے کو کچھ ہو جائے تو سب اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ساری دنیا کو اپنی بپتا سناتے ہیں۔ کبھی کبھی تو بے رحم ہو کر انسانوں پر جھپٹتے بھی ہیں۔

دادا کو پرندوں سے اتنی محبت کیوں تھی؟ ایک دن مجھے اس سوال کا آدھا جواب مل گیا۔ ابا نے بتایا ہے کہ جب دادا کے ختنے ہوئے تھے تو برادری اور ہمسائیوں میں سے کسی نے انھیں دیسی گھی، کسی نے مصری، کسی نے چند روپے، کسی نے چوزے دیے۔ دور کے ایک رشتے دار نے کبوتروں کا جوڑا دیا۔ تب دادا یہی کوئی پانچ یا چھ برس کے ہوں گے۔ دادا کہتے تھے کہ جب غلام پرائیں نے انھیں مٹی کی تازہ صحنک کو الٹا کر ننگا بٹھایا تھا اور کہا تھا کہ وہ دیکھو اوپر سبز چڑی ہے

، جیسے ہی انھوں نے اوپر نظر اٹھائی تو ظالم نے استرا چلا دیا تھا تو درد کی تیز کاٹتی ہوئی لہر ناگوں کے بیچ سے ہوتی ہوئی سارے بدن میں پھیل گئی تھی ، اور وہ پوری قوت سے چیخ پڑے تھے۔ دادا کبوتروں کی جوڑی کو درد کی اس لہر کا انعام سمجھتے تھے۔ کوئی ایک ہفتے بعد وہ کبوتر اڑتے ہوئے، ہمسائیوں کے درخت پر جا بیٹھے۔ دادا پیچھے گئے مگر وہ نہیں ملے۔ دادا نے سیکڑوں درخت کھنگال ڈالے، اپنے زخم خراب کر ڈالے، مگر انھیں معلوم نہ ہو سکا کہ وہ چوری ہوئے کہ شکار۔ میں نے نفسیات نہیں پڑھی، پر مجھے لگتا ہے کہ کبوتر دادا کو اس دنیا میں لے گئے تھے، جہاں سے ہم سب نکالے گئے ہیں یا روانہ کیے گئے ہیں، اور جس کا احساس ہم بچپن میں پرندوں، جانوروں سے جی بہلا کر کرتے ہیں اور بڑے ہو کر خسارے کی صورت۔ میرا یہ بھی اندازہ ہے کہ دادا نے کبوتروں کی تلاش جس لگن سے کی، وہ ان کی شخصیت کا مستقل حصہ بن گئی۔ کوئی کمی، کوئی گم شدگی کس طرح آدمی کو سدا کے لیے بدل دیتی ہے، یہ بات مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے، جس نے اپنے دادا کو ان کی کمی ہی سے پہچانا ہے!

دادا اکثر میرے خواب میں آئے ہیں۔ چند دن پہلے خواب میں آئے۔ سفید پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کسی لمبے سفر سے کئی دنوں بعد گھر پہنچے ہیں۔ مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے انھیں پانی دیا۔ آدھا گلاس پیا اور باقی لوٹاتے ہوئے کہا: اسے رکھ لو پھر آ کر پیوں گا۔ کہنے لگے، آدمی پانی ضائع کرتا ہے مگر درخت جتنا پانی پیتے ہیں اس سے زیادہ لوٹاتے ہیں۔ خواب سے جاگا تو مجھے ابا کی کہی ہوئی باتیں یاد آئیں۔

میں نے درختوں کی باتیں سننے کی کافی کوشش کی ہے۔ کامیاب نہیں ہوا۔ مجھے دادا کی باتوں پر کبھی شک بھی نہیں ہوا۔ آدمی کو ایک بات پر یقین ہو مگر وہ بات واقع نہ ہو تو آدمی امتحان میں ہوتا ہے۔ اس کا یقین سچا ہے یا اس کے حواس؟ گڑبڑ کہاں ہے؟ باہر یا اندر؟ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ آدمی زیادہ دیر تک امتحان میں نہیں رہ سکتا۔ امتحان کی حالت تو ایک چوٹی

پر کھڑے ہونے جیسی ہے۔ اسے یا تو کسی جھاڑی کا سہارا لینا ہے یا چوٹی سے نیچے اترنا ہے۔ اوپر پہنچنا جس قدر مشکل ہے، نیچے اترنا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ لیکن چوٹی پر کھڑے رہنا، مشکل اور آسانی کی عام حالتوں سے آگے کی کوئی حالت ہے۔ وہی حالت جو میری تھی۔ جو شخص میری پیدائش سے پہلے مجھے اپنی گود میں کھلاتا رہا ہے، مجھ سے باتیں کرتا رہا ہے، میرے بارے میں باتیں کرتا رہا ہے اور برابر میرے خوابوں میں مجھ سے اپنے حال احوال کہتا رہا ہے، اس کی کوئی بات غلط کیسے ہو سکتی ہے؟ ادھر میں گھنٹوں درختوں کے نیچے بیٹھتا ہوں۔ قطار در قطار درختوں میں چلتا ہوں، مگر ان کی کوئی بات مجھے سنائی نہیں دیتی۔ مان لیا کہ درختوں کی زبان کچھ اور ہو گی، پر آواز تو ہو گی۔ میں نے ہر پرندے کی آواز بھی الگ پہچاننے کی کوشش کی ہے، اس خیال سے کہ شاید درختوں کی آواز، ان کی آواز میں مل جاتی ہو اور پہچان میں نہ آتی ہو، لیکن ہر بار مجھے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک آخری کام بھی میں نے کر کے دیکھ لیا ہے۔ دنیا میں سب سے اونچی آواز وہ ہے جو آدمی کے اندر ہوتی ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کی آواز اوّل تو سنائی نہیں دیتی، سنائی دے تو اس کا مطلب وہی ہوتا ہے جو آدمی کے اندر کی آواز کا ہوتا ہے۔ یہ اونچی آواز اس عفریت کی مانند ہے جس کا رزق دنیا جہان کی سب آوازیں ہیں۔ میں نے اس آواز کو خاموش کرنے کی پوری کوشش کی ہے، تاکہ درختوں کی آواز سن سکوں۔ دو ایک لمحوں کے لیے یہ آواز خاموش ہوئی ہے، اس سے مجھے درختوں میں صرف خاموشی سنائی دی۔ میں اب تک تذبذب میں ہوں کہ اس وقت دنیا کی سب سے اونچی آواز خاموش ہوئی تھی یا وہی خاموشی درختوں کی زبان تھی۔

یا خدا، امتحان کی اس حالت سے کیسے نکلوں؟ ایک رات سونے سے پہلے جیسے کسی نے مجھے اس سوال کا جواب دیا۔ دادا سے بات کرو۔ اب تک میں دادا جان کی باتیں سنتا آیا تھا۔ ان سے بات کرنے کے خیال ہی سے روح خوش ہو گئی۔ پر یہ خوشی ایک لمحے کی تھی۔ خیال کی خوشیوں

کے ساتھ یہی تو مصیبت ہے: بس پل بھر کی چمک اور چمک بھی ایسی جس کے بارے میں آدمی یقین و بے یقینی کی حالت میں رہتا ہے۔ دادا سے بات کیسے کی جائے؟ میں نے ایک شخص کے بارے میں سن رکھا تھا کہ وہ روحوں کو بلانے کا علم رکھتا ہے۔ کیوں نہ اس سے ملا جائے۔ لیکن اس سے پہلے میں نے ایک اور طریقہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلی مرتبہ جب دادا جان خواب میں آئیں گے تو ان سے پوچھوں گا کہ وہ کیسے درختوں کی باتیں سن لیتے تھے۔ یہ خیال اچھا تھا اور کسی دوسرے کی معرفت دادا کی روح سے بات کرنے سے کہیں زیادہ قابل عمل تھا۔ دو تین روز بعد دادا خواب میں آئے۔ آتے ہی پوچھا، وہ بچا ہوا پانی کہاں ہے؟ میں نے کہیں رکھا تھا، پر مجھے یاد نہیں آیا کہ کہاں رکھا تھا۔ میں نے کہا اور لا دوں؟ ہلکی سی خفگی سے کہنے لگے، میں نے تو اپنے حصے کا وہی اپنا بچا ہوا پانی پینا ہے۔ اس کے فوراً بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں حیران ہوا کہ یہ خواب کس طرح پچھلے خواب سے جڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے درختوں والی بات تو ان سے پوچھی ہی نہیں۔ اس کے بعد وہ کئی بار خواب میں آئے، مگر مجھے خواب سے جاگنے کے بعد یاد آتا اور اس کے ساتھ ہی تاسف طاری ہوتا۔ خواب دیکھتے ہوئے کبھی خیال تک نہ آیا کہ دادا سے کچھ پوچھنا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نتیجے پر پہنچا کہ خواب میں دادا سے میں نہیں، کوئی اور ملتا ہے۔ میرے لیے یہ ایک نیا امتحان تھا۔ وہ کون ہے جو میرے خواب میں آتا ہے، میرے ہی دادا سے ملتا ہے، پر میری زبان نہیں سمجھتا؟ یہ میرے اندر داخل کہاں سے ہوا؟ کہاں چھپا ہوا ہے؟ ایک بار خیال آیا کہ کیا پتا خواب میں میرے دادا نہ آتے ہوں، خواب والے شخص کے دادا ہوں، مگر میں نے یہ خیال جھٹک دیا۔ آخر آدمی کتنے امتحانوں سے گزرے؟ میں نے دادا کی روح سے ملنے کا خیال بھی چھوڑ دیا۔

پر اب، کئی سالوں بعد مجھے کچھ کچھ سمجھ آ گئی ہے کہ گڑبڑ ہے کہاں۔

میں کوئی دس سال بعد اپنے آبائی گھر گیا۔ ابا اور اماں میرے پاس شہر چلے آئے تھے۔ زمینیں ٹھیکے پر دے دی تھیں۔ کچھ دنوں بعد دونوں اداس ہو جاتے تو چھوٹے بھائی کے پاس چلے جاتے۔ وہاں جی نہ لگتا تو میرے پاس آ جاتے۔ اکھڑے اکھڑے رہتے۔ آبائی گھر کو ہم نے تالا لگا رکھا تھا۔ کام کی سب چیزیں ساتھ لے آئے تھے۔ کاٹھ کباڑ کو کمروں میں بند کر کے ان کے دروازوں پر تالے چڑھا دیے تھے۔ گڑبڑ یہ ہوئی کہ ہم نے گھر کو اماں ابا اور سامان سے عبارت سمجھا۔ ہم نے سوچا جہاں اماں ابا اور روزمرہ استعمال کی پرانی چیزیں ہوں گی، وہی گھر بن جائے گا۔ دیواروں اور دروازوں سے گھر تھوڑی بنتے ہیں۔ چھوٹے بھائی سال میں دو ایک مرتبہ گاؤں کا چکر لگاتے تو حویلی اور کمروں کے تالے کھول کر دیکھ لیتے۔ فون پر بتا دیتے۔ میں دس سال بعد گیا۔ سارا گھر اس گھر سے بہت مختلف تھا جو میرے ذہن میں تھا۔ حویلی کا دروازہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ یہ دروازہ شیشم کے اسی درخت سے بنا تھا، جس کا ذکر دادا افسوس کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا اور جگہ جگہ سے چٹخ گیا تھا۔ صحن میں کلر کی ابھری ہوئی سفیدی یہاں وہاں نظر آ رہی تھی۔ ایک نحوست آمیز اداسی سارے پر طاری تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے صحن میں سایہ سا گزرتے دیکھا۔ میرا دل کٹ کے رہ گیا۔ کمروں کے اندر عجب سی سیلن زدہ بو تھی۔ شاید کچھ چوہے مرے پڑے تھے۔ کمروں سے نکل کر جیسے ہی صحن میں دوبارہ آیا تو شرینہہ اور ٹاہلی پر نظر پڑی۔ اچانک کئی باتیں یاد آئیں۔ میں دوڑا، دونوں کے تنوں سے باری باری لپٹا۔ میں اس لمس کی کیفیت بتانے سے قاصر ہوں۔ میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔ اچانک مجھے لگا کہ آج تو درخت مجھ سے باتیں کریں گے۔ میں دوبارہ ان سے لپٹا۔ کان ان کے تنوں سے لگائے رکھے، مگر سوائے ہوا کے اداس شور کے کچھ سنائی نہیں دیا۔ اسی لمحے ایک نئی بات میں نے محسوس کی۔ جب ہم نے یہ گھر چھوڑا تھا تو سب درختوں کے چلھے چوڑے تھے، جن میں دادا جان اور ابا جی باقاعدگی سے پانی دیا کرتے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ وہ چلھے اب موجود نہیں

تھے، درختوں کی جڑیں باہر کی طرف نکل آئی تھیں۔ٹاہلی ذرا اونچی جگہ تھی اور اس کے تنے سے نکلنے والی دو موٹی شاخوں میں سے ایک شاخ خشک ہوگئی تھی۔میں نے شریںہہ کی جڑ کو دیکھا تو وہ آگے ہی آگے چلتی دکھائی دی۔میں ایک نامعلوم تجسس کے تحت اس کے ساتھ چلتا گیا۔وہ جڑ ٹاہلی کی جڑ سے جا کر مل گئی تھی۔یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں حیرت میں تھا۔

میں ایک امتحان سے تو نکل آیا،مگر خجالت کی حالت میں اب تک ہوں،دادا کے سامنے۔

درخت مجھ سے باتیں نہیں کرتے،مگر وہ ایک دوسرے سے باتیں ہی نہیں کرتے، ایک گرنے لگے تو اس کا ہاتھ بھی پکڑتے ہیں۔

عورت کو زیادہ محبت کس سے ہے؟

اس گاؤں کے لوگ تھانے کچہری میں صرف اس مقدمے کو لے جاتے تھے، جس کا متفقہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے۔ گاؤں کی حدود میں ہونے والے ہر واقعے کا فیصلہ ان دس افراد کی پریـنہہ کرتی تھی، جس میں ہر برادری کا ایک ایک بزرگ شامل تھا۔ گاؤں کی حدود وہاں تک تھیں جہاں تک اس کے باشندوں کی زمینیں تھیں۔ گاؤں میں کل دس برادریاں تھیں۔ گاؤں کافی پرانا اور دور افتادہ تھا مگر اس کی پریـنہہ کوئی پینتیس سال پہلے اس وقت بنائی گئی تھی، جب وہاں سیلاب آیا تھا اور آدھے سے زیادہ گھروں کو زمین بوس کر گیا تھا۔ گاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بچوں کے اپنے پاؤں پر گیلی ریت سے بنائے گئے گھروں کو کسی بڑے نے غصے میں ٹھوکر ماری ہو اور سب کو بکھیر دیا ہو۔ کسی کی آدھی چھت گری ہوئی تھی۔ کسی کی آدھی دیواریں ٹوٹ گئی تھیں۔ کچھ پورے کے پورے زمین پر آرہے، جن میں سے ان کے شہتیر، بالے اور سرکنڈوں سے بنی پتلیں انتڑیوں کی طرح باہر نکلی محسوس ہوتی ہوں۔ حکومت یا کوئی ادارہ ان کی مدد کو نہیں آیا تو سب گاؤں والوں نے مل کر گھروں کو تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلے پر وہ اچانک ایک شام کو پہنچے تھے۔ کچھ بزرگ مرد وخواتین اور جوان ان ٹوٹے گھروں کے ملبے کے درمیان کھڑے تھے۔ چپ اور اداس تھے۔ سب نے محسوس کیا کہ ملبہ انھیں ان لاشوں کی یاد دلاتا ہے، جنھیں دفنایا نہ گیا ہو۔ کون ہے جو اپنے پیاروں کی لاشوں کو اتنے دنوں تک دیکھنے کی تاب

لا سکے؟ ایک بوڑھا بولا۔ لاش یہ نہیں یاد دلاتی کہ کوئی شخص زندہ تھا، یہ یقین دلاتی ہے کہ زندگی آخر کار ختم ہو جاتی ہے۔ دوسرا شخص بولا جو دوسرے گاؤں کے سکول میں دینیات کا استاد تھا۔ ایک نوجوان جو تازہ تازہ ایف اے کا امتحان دے کر شہر سے لوٹا تھا اور کتابیں پڑھنے کا شوقین تھا، بولا: ''ویرانی اور وحشت کو دیر تک برداشت کیا جا سکتا ہے، ٹوٹ پھوٹ کو نہیں۔ بے گھری کو بھی کوئی نہ کوئی آسرا مل جاتا ہے، بگاڑ اور خرابی کو نہیں''۔ کچھ بڑوں نے یہ کہا کہ انھیں خوابوں میں کٹے سر، ٹوٹی ٹانگوں، ٹوٹے بازوؤں والے آدمی، چرند پرند نظر آتے ہیں۔ ایک بوڑھے نے کہا کہ آدمی کے خواب کی حد بھی اس کے گھر یا زیادہ سے زیادہ اس کی بستی تک ہوتی ہے۔ اس پر ایک بوڑھی عورت نے گرہ لگائی۔ گھر ہوں گے تو خواب ہوں گے۔ اسی شام انھوں نے مل کر گھر تعمیر کرنے کا عزم اور فیصلہ کیا۔ وہیں انھوں نے پریہنہ بنا ڈالی۔ طے کیا کہ گاؤں کے سارے مسائل مل کر حل کریں گے۔

ان پینتیس سالوں میں یہ دوسرا مقدمہ تھا، جس کے فیصلے پر پریہنہ کے افراد تقسیم تھے۔ پہلا مقدمہ اکلوتے بیٹے کے ہاتھوں اپنے بوڑھے باپ کے قتل کا تھا۔ دونوں میں چند ایکڑ کی جائیداد کا تنازع تھا، جس کی تفصیل مقدمے کی مدعی، بوڑھے مقتول کی بیوی نے بعد میں بتائی۔

گاؤں میں اس سے پہلے بھی قتل ہوئے تھے مگر ایک بیٹے کے ہاتھوں باپ کا قتل پہلا واقعہ تھا۔ اس طرح کے قتل کے قصے گاؤں والوں نے سن رکھے تھے جو انھیں ناقابل یقین لگتے تھے، مگر سنا ہوا قصہ جب ایک ناقابل تردید سچائی کے طور پر ان کے سامنے دہرایا گیا تو گاؤں کے بڑوں پر خاص طور پر رنج آمیز ہیبت طاری ہو گئی۔ کوئی بیٹا کیسے اپنے باپ اور وہ بھی بوڑھے باپ کو قتل کر سکتا ہے؟ یہ سوال اس بوڑھے کے قتل سے لے کر اسے دفنانے اور پھر اس کا مقدمہ سننے تک، ان بڑوں کے ذہنوں میں گونجتا رہا۔ گاؤں کے بیشتر بڑے انکار کی حالت میں تھے، سوائے دینیات کے اس استاد، ماسٹر شمس کے، جس نے سیلاب کے بعد کہا تھا کہ ہر لاش یہ یقین دلاتی ہے کہ زندگی آخر کار ختم ہو جاتی

ہے۔ اس نے کہا۔ ہر قتل یہ یقین دلاتا ہے کہ زندگی کے جھگڑے، مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتے۔ وہ بوڑھا ہو چکا تھا۔ ایک زمانے میں اسے مذاہب عالم کے مطالعے کا کافی شوق تھا۔ پھر تاریخ کی کتابیں پڑھنا شروع کیں، مگر اب وہ صرف گاؤں کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر سوچ بچار کرتا تھا اور گاؤں والوں سے لمبی بحثیں کیا کرتا۔ وہ کہا کرتا، زندگی کے سب چھوٹے بڑے راز، جنھیں جاننے کے لیے لوگوں نے دور دراز کے سفر کیے، غاروں پہاڑوں میں عمریں بتا دیں، وہ آپ کے آس پاس کی زندگی کے واقعات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ انھیں پڑھنے کا سلیقہ آنا چاہیے۔ اکثر لوگ اُسے نیم پاگل کہتے تھے اور جہاں وہ بحث کر رہا ہوتا، وہاں سے بچ کر گزرتے۔ جس وقت بوڑھے مقتول کی قبر پر مٹی ڈالی جا رہی تھی، اس نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا، صرف زندگی ختم نہیں ہوتی، رشتے ناطے بھی ختم ہوتے ہیں۔ زندگی کی حقیقت صرف فنا نہیں، فراموشی بھی ہے۔ جس مولوی صاحب نے مقتول کا جنازہ پڑھایا تھا، اس نے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔ مولوی صاحب انتظار میں تھے کہ جیسے ہی قبر پر پریسو کی نوکیلی شاخیں رکھی جائیں، وہ تلاوت کریں اور مرحوم کی مغفرت کی دعا کروائیں۔ قاتل بھی قبر پر مٹی ڈالنے والوں میں شامل تھا جسے اس کے ماموں نے وہیں دھکا دیا اور وہ ایک بچے کی قبر پر جا گرا تھا۔ وہ جس وقت آہ بھرتے ہوئے اٹھا ہے، اس وقت اس کے کاندھے پر ماسٹر شمس نے ہاتھ رکھا تھا۔ سب نے اس کی طرف دیکھا۔ اس تجسس سے کہ وہ اسے کیا کہتا ہے، مگر وہ چپ رہا۔

ماسٹر شمس کچھ عرصہ پرینہہ کا حصہ بھی رہا تھا۔ باقی نو ارکان نے متفقہ فیصلے کے بعد اسے الگ کر دیا تھا کہ وہ ایسے سوال کرتا تھا جنھیں سن کر پرینہہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے بجائے تذبذب میں پڑ جاتی تھی۔

پانچ لوگ اس حق میں تھے کہ قاتل بیٹے کو پھانسی ملنی چاہیے، جب کہ چار لوگوں کی رائے

تھی کہ اسے گاؤں بدر کر دیا جائے۔ان چاروں کا خیال تھا کہ مقتول کی بوڑھی بیوی ابھی غصے اور رنج کی کیفیت میں ہے،اور یہ دونوں جذبے عارضی ہیں۔پہلے پانچوں میں سے ایک آدمی بولا۔ انتقام کا جذبہ بھی ہوسکتا ہے اور وہ عارضی نہیں ہوتا۔دوسرے چاروں میں سے ایک شخص بولا، جو شخص دوطرح کی جذبات میں گھرا ہو، وہ انتقام نہیں لے سکتا۔جلد ہی وہ ماں کے جذبات محسوس کرے گی اور ماں کے جذبات عارضی نہیں ہوتے۔اس نے ایک اور بات بھی کہی جسے لوگوں نے سنا ضرور پر اہمیت نہیں دی۔اس نے کہا کہ اگر ماں کے دل میں واقعی انتقام کا جذبہ ہوتا تو وہ اب تک بیٹے کا گلا گھونٹ چکی ہوتی۔وہ چکی کے دو پاٹوں کے بیچ ہے۔جب یہ کارروائی چل رہی تھی، ماسٹر شمس بھی وہیں موجود تھا۔اس نے بولنے کی اجازت طلب کی جو اسے بادل ناخواستہ دی گئی۔وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سب لوگوں پر نگاہ کر کے گویا ہوا۔یہ فیصلہ کون کرے گا کہ چکی کا کون سا پاٹ زیادہ بھاری ہے؟ سب کا خیال مدعیہ کی طرف گیا جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھی۔دوسری طرف پہلے پانچوں کی دلیل تھی کہ اتنے سنگین معاملے کا فیصلہ جذبات کی بنیاد پر نہیں واقعے کی نسبت سے کرنا چاہیے،اور واقعہ سیدھا سادہ قتل کا ہے۔قتل کوئی ہو، قتل کرنے والا کوئی ہو، قتل کا سبب کچھ ہو، قتل کی نیت کسی حالت میں کی گئی ہو، جب قتل ثابت ہو جائے تو پھانسی دے دی جانی چاہیے۔(پھانسی کے لیے طے تھا کہ وہ عدالت کے ذریعے دلوائی جائے گی) اور اس کا تعلق صرف ایک عورت کے شوہر کے قتل سے نہیں، اس گاؤں کے ایک بزرگ کے قتل سے بھی ہے (یہ کہتے ہوئے اس نے وہ رنج آمیز ہیبت ایک بار پھر محسوس کی جو اس نے قتل کی اطلاع سنتے ہی پہلے لمحے محسوس کی تھی) لیکن اس کا جواب باقی چاروں نے یہ دیا کہ قتل جیسا واقعہ بغیر کسی جذبے کے نہیں ہوتا، اس لیے جذبے کو واقعے سے الگ کیسے کیا جا سکتا ہے۔یہ سنتے ہی ماسٹر شمس بغیر اجازت کے اٹھ کھڑا ہوا اور کہنے لگا۔کون طے کرے گا کہ قاتل نے کس جذبے کے تحت قتل کیا یا وہ سرے سے جذبات سے خالی تھا؟ اس کی بات پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔اس مقدمے پر لمبی چوڑی بحث کا

ایک سبب یہ بھی تھا کہ مقتول، اسی پر۔نہہ کا دسواں رکن تھا۔اس بات پر بھی کافی بحث ہوئی کہ پہلے دسواں رکن شامل کیا جائے، تب یہ مقدمہ سنا جائے یا مقدمے کے فیصلے کے بعد،لیکن پر۔نہہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔تاہم اس بات پر سب متفق تھے کہ اس مقدمے کے بعد مقتول کی برادری کے کسی بزرگ کو پر۔نہہ کا دسواں رکن بنالیا جائے گا۔چوں کہ پر۔نہہ تقسیم ہوگئی،اس لیے اس قتل کا مقدمہ تھانے میں درج کرادیا گیا مگر اس سے پہلے آخری بار مدعیہ سے پوچھا گیا کہ کیا وہ بیٹے کو معاف کرنا چاہتی ہے؟ نہیں، میں اپنے بوڑھے شوہر کے قاتل کو معاف نہیں کرسکتی۔اس نے سخت لہجے میں کہا۔کسی نے کہا ایک بار پھر سوچ لو وہ تمھارا اکلوتا بیٹا ہے۔وہ طیش میں آگئی۔سر ننگا ہوجائے تو دوسری کوئی بات سوچی جاسکتی ہے؟ مقدمہ عدالت میں چلا،مگر فیصلے سے پہلے ہی مدعیہ کا انتقال ہوگیا اور بیٹا رہا ہوگیا،مگر وہ کہیں شہر رہنے کے لیے چلا گیا۔متفقہ طور پر ان کا گھر ان کے قریبی عزیزوں کو دے دیا گیا۔ماسٹر شمس نے ایک دن اسی گھر کے سامنے کھڑے ہوکر کہا کہ چکی کے دو پاٹوں میں آنے کی اب کس کی باری ہے؟

سہ پہر کا وقت۔گرمیوں کا موسم۔گاؤں کے درمیان درختوں کے ایک مختصر جھنڈ کے سائے میں، چارپائیوں پر دس رکنی پر۔نہہ بیٹھی ہے۔سامنے چارپائی پر کنیز اکیلی بیٹھی ہے۔آس پاس نیم دائرے کی شکل میں بچھی چارپائیوں پر درجنوں جوان اور بزرگ موجود ہیں،جن کو مجلس کی کارروائی صرف سننے کی اجازت ہے۔ان میں ماسٹر شمس موجود نہیں ہے۔چھ ماہ پہلے اس کا انتقال ہوگیا تھا۔چند دن پہلے ایک چارسالہ بچی کے قتل کا مقدمہ زیر بحث ہے۔سب لوگ واقعہ سن چکے ہیں۔

غلام لوہار نے دوسری شادی کنیز سے کی،جب کہ کنیز کی یہ چوتھی شادی تھی۔کنیز پاس والے گاؤں کے الٰہی بخش سیال کی بڑی بیٹی تھی۔کنیز پندرہ سال کی تھی کہ اس کی شادی اپنے ماموں زاد سے کردی گئی۔چھ ماہ بعد طلاق ہوگئی۔دوسری شادی ایک سال بعد چچا زاد سے کی

گئی۔ اس سے ایک بیٹا ہوا۔ یہ شادی بھی ناکام ہوئی۔ بیس سال کی عمر میں اس نے خود بھاگ کر غیر قوم کے ایک بڑی عمر کے آدمی سے شادی کر لی، جو اسی گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی ہوئی۔ اسی دوران میں اس کے تعلقات غلام لوہار سے قائم ہوئے۔ شوہر نے طلاق دے دی۔ وہ بیٹی کو لے کر غلام کے پاس آ گئی۔ دونوں نے چار ماہ بعد نکاح کر لیا۔ ایک برس بعد غلام لوہار سے ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ کنیز سے اس کے بوڑھے والدین نے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا۔ ایک بھائی تھا، جسے لوگ غیرت دلاتے تھے، جب وہ عید یا برادری کی شادی غمی کے موقع پر گاؤں آتا تھا، مگر وہ کوئی جواب نہ دیتا۔ اس کے جانے کے بعد لوگ کہتے کہ شہر میں نوکری کرنے والے بے غیرت ہو جاتے ہیں۔ مگر عجیب بات یہ تھی کہ کوئی شخص کنیز کو اس کے منہ پر برا بھلا نہیں کہتا تھا۔ ایک تو وہ راہ میں آتے جاتے سب مردوں عورتوں کو سلام کرتی، ان سے حال احوال پوچھتی۔ سب کی سلامتی کی دعا کرتی۔ مردوں سے بات کرتے ہوئے سر جھکائے رکھتی اور شائستگی کا مظاہرہ کرتی۔ گاؤں کے ہر گھر کے دکھ سکھ میں بڑھ چڑھ کر شریک ہوتی۔ کوئی بیمار ہوتا تو سب سے پہلے وہ پہنچی ہوتی۔ کہیں شادی ہوتی تو چھوٹے بڑے سب کاموں میں حصہ لیتی۔ گاؤں کی عورتوں میں وہ خاصی مقبول ہو گئی تھی، اور اس کا ایک سبب، اپنے معاشقوں کو بیان کرنا بھی تھا۔ کئی مرتبہ تو یہ تک بتا دیتی کہ اس کے چچا زاد سے پیدا ہونے والا بیٹا دراصل اس کے ماموں زاد کا ہے جسے وہ طلاق کے بعد دو چار مرتبہ اس لیے ملی کہ اسے وہ اب بھی اچھا لگتا تھا۔ کہتی، وہ جب بھی اپنے بیٹے کو گلے لگاتی ہے تو اسے اپنا ماموں زاد حسرت سے یاد آتا ہے۔ باقی بچوں کو حلالی کہتی۔ کچھ عورتیں ہنستیں، اس کی جرأت کی داد دیتیں، اور کچھ سوال کر بیٹھتیں کہ اسے یہ سب کرتے ہوئے شرم نہیں آتی تو کہتی تب تک شرم آتی ہے جب تک ڈر رہتا ہے۔ وہ لڑتی کسی سے نہیں تھی، بس چپ ہو جایا کرتی۔ سنا ہے اپنے شوہروں کے ساتھ بھی اس کا رویہ اسی قسم کا ہوا کرتا تھا۔ نیا شوہر چند دنوں بعد ہی پہلے شوہروں کا طعنہ دیتا تو وہ چپ ہو جاتی۔ جب اسے کئی دن چپ

رہنا پڑتا تو ایک دن چپکے سے غائب ہو جاتی، اور کچھ دنوں بعد معلوم ہوتا کہ وہ کسی دوسرے مرد کے ساتھ رہنے لگی ہے۔

چند دن پہلے غلام لوہار کے گھر سے صبح کے وقت رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ معلوم ہوا، اس کی پانچ سالہ اکلوتی بیٹی مرگئی ہے۔ پہلے کہا گیا کہ وہ ایک حادثے میں مری ہے۔ کنیز سب آنے والوں کو اس کے چہرے پر لگی خراشیں اور اس کی ٹوٹی پسلیاں دکھاتی اور ایک موٹر سائیکل سوار کو بددعائیں دیتی، جس نے پیچھے سے ٹکر ماری اور بھاگ گیا۔ لیکن جب بچی کو نہلایا جانے لگا تو ایک دوسری کہانی سامنے آئی۔ گاؤں کے اس سرے سے اس سرے تک یہ خبر تیزی سے پھیلی کہ بچی سے زیادتی ہوئی تھی۔ کچھ لوگوں نے طبی معائنے کی تجویز دی۔ بعض نے مخالفت کی کہ اس طرح پورے گاؤں کی بدنامی ہوگی۔ غلام لوہار نے بچی کو فوراً دفنانے کا فیصلہ سنایا۔ تیسرے دن اس نے گاؤں کی دس رکنی پریںہہ سے درخواست کی کہ اس کی بیٹی کو زیادتی کے بعد قتل کیا گیا تھا، ذمہ دار کنیز ہے؛ وہ انصاف چاہتا ہے۔

پریںہہ نے آج تک کسی عورت کو جرح کے لیے طلب نہیں کیا تھا۔ اس مرتبہ یہ روایت توڑنے کا فیصلہ ہوا۔ دسوں افراد نے اس سے سوال پوچھنے شروع کیے۔

کیا تو نے بچی کو قتل کیا؟

نہیں۔ اس نے سر جھکائے جواب دیا۔

کس نے قتل کیا؟

احمد یار نے۔ وہ بدستور سر جھکائے ہوئے تھی۔

وہ کون ہے؟

....

تیرا اس سے کیا تعلق ہے؟

ابھی تک ناجائز ہے۔اس نے صاف کہا۔

(سب ہنس پڑے)

اس نے بچی کو قتل کیوں کیا؟

اس نے چرس پی ہوئی تھی۔ بچی دوسرے کمرے میں تھی، میں جب پہنچی تو وہ بچی کا گلا دبا رہا تھا۔

تو نے کچھ نہیں کیا؟

......

کیوں؟ کس قسم کی ماں۔ ہے تو؟

....

تو نے حادثہ کیوں بتایا؟

میں ماں ہوں۔

یہ سن کر کچھ لوگ طنزاً ہنس پڑے، کچھ حیران ہوئے ،بعض کے دل وحشت سے بھر گئے اور غلام لوہار اس کی طرف موٹی گالی دیتے ہوئے بڑھا، جسے لوگوں نے پکڑ لیا۔ پر ینہہ کے سب سے بزرگ آدمی نے سب کو خاموش ہونے کے لیے کہا اور پوچھا۔

ماں بچوں کو بچاتی ہے یا مارتی ہے؟

....

بولتی کیوں نہیں۔ایک رکن غصے میں بولا۔

میں نے نہیں مارا۔

اسے اپنے ساتھ لے کے کیوں گئی۔اس یار کا ہاتھ کیوں نہیں توڑ دیا؟ ایک اور رکن نے سوال کیا۔

وہ گھر میں بھی محفوظ نہیں تھی۔ وہ مسلسل نیچے دیکھتے ہوئے، پاؤں کے انگوٹھوں سے زمین کھود رہی تھی۔

بلیاں بھی کتوں کو چیر ڈالتی ہیں، وہ ان کے بچوں کی طرف بڑھیں۔ تم.....تم سے بہتر تو جانور ہیں۔ ایک اور رکن دھاڑا۔

وہ بہت زور آور تھا۔ میں ڈر گئی۔ پر میں نے اسے گالیاں دی تھیں اور اس کے منہ پر تھوکا تھا۔

حادثہ کیوں بتایا۔ کیا اپنے یار کو بچانا چاہتی تھی؟ کیا تو بچی سے زیادہ اس یار سے محبت کرتی ہے؟ ایک رکن نے دوبارہ یہ سوال پوچھا۔ (اسے اگلے دن عین عشا کی نماز پڑھنے کے دوران میں ماسٹر شمس کی چکی کے پاٹوں سے متعلق کہی ہوئی بات یاد آئی اور وہ اداس ہو گیا مگر فوراً نہ سمجھ سکا کہ ماسٹر شمس کو یاد کر کے اداس ہوا تھا یا اس وجہ سے کہ کنیز سے اتنا سخت سوال کرتے ہوئے، اسے کیوں خیال نہ آیا کہ وہ بھاری پاٹوں کے بیچ پس رہی تھی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے اس کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔)

.....نہیں۔ بالکل نہیں۔

پھر؟

وہ کافی دیر خاموش رہی۔

آخر کار اس نے سر جھکائے ہوئے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا۔ ''میں چاہتی تھی کہ میری بیٹی اسی طرح قبر میں جائے، جیسے میرے پیٹ سے نکلی تھی... میں قسم کھاتی ہوں کہ اس کا باپ واقعی غلام لوہار ہے''۔ سب نے دیکھا اس کے آنسو سیدھے اس کے پاؤں کے انگوٹھوں پر گر رہے ہیں، پر اس کی آخری بات پر۔ نہہ کے کسی آدمی کو سمجھ نہ آئی؛ بعد میں گاؤں کی چند عورتیں ہی کچھ یاد کر کے اسے سمجھ سکیں۔

پرانا اور نیا نظام انصاف

آخر ہر کام کا خاتمہ اکتاہٹ پر کیوں ہوتا ہے؟ اس نے اپنے مشیر اعلیٰ سے پوچھا۔
مشیر نے شام تک جواب دینے کی مہلت مانگی۔ شام کو مشیر اعلیٰ دربار میں حاضر ہوا۔
عرض کی۔ اکتاہٹ بادشاہ کی شان ہے۔ کیڑے مکوڑے اس سے محروم ہیں۔

بادشاہ ایک پل کے لیے مطمئن ہوا، خوش نہیں۔

مشیر نے بادشاہ کی حالت بھانپ لی اور کہا۔ بادشاہ اس لیے اکتاتا ہے کہ وہ دنیا کا سب سے ذہین انسان ہوتا ہے۔ عام انسان کا ذہن زیادہ دیر کسی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا، اور سب سے بڑا انسانی ذہن ایک پل کے لیے ایک حالت پر قائم نہیں رہ سکتا۔

بادشاہ پھر ایک پل کے لیے مطمئن نظر آیا۔ بولا: لیکن اکتاہٹ کئی کئی دن رہتی ہے۔

مشیر اعلیٰ کو اپنے پاؤں تلے سے زمین نکلتی محسوس ہوئی۔ اگر اس بار بھی بادشاہ ایک پل کے لیے مطمئن ہوا تو وہ جان سے گیا، اس نے سوچا۔ مشیر اعلیٰ تجربے سے سیکھ چکا تھا کہ جس وقت دربار کا جلاد بس اشارے کا منتظر محسوس ہوتو اس کا ذہن یا تو پوری طرح ماؤف ہو جاتا ہے، یا جاگ جاتا ہے۔ آج اس کا ذہن پوری طرح جاگ گیا تھا۔

جس طرح بادشاہ کا ذہن سب سے بڑا ہے، اسی طرح اس کا دل بھی سب سے بڑا ہے۔ رعایا کے ہر طرح کے دکھوں کو صرف آپ جیسا بڑا بادشاہ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ حضور کی

اکتاہٹ ، رعایا کے دکھوں کو دن رات محسوس کرنے کے باعث ہے۔(یہ میں کیا کہہ بیٹھا ہوں،مشیر اعلیٰ دل میں گھبرایا)۔

میری رعایا کو کیا دکھ ہوسکتا ہے؟ بادشاہ حیران ہوکر بولا۔

مشیر اعلیٰ کو جلاد کی تلوار اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔لیکن اس نے آخری کوشش کرڈالنے کا فیصلہ کیا۔ سینے پر ہاتھ باندھے،سر جھکاتے ہوئے کہا: رعایا دکھی ہے کہ وہ ظل الٰہی کی عطا کی ہوئی نعمتوں کے لیے ویسا اظہار تشکر نہیں کرسکتی،جیسا کہ حق ہے۔

بادشاہ کے چہرے پر چمک پیدا ہوئی اور اکتاہٹ غائب ہوگئی۔

مشیر اعلیٰ کے چہرے کا تناؤ بھی دور ہوا۔اسی پل اسے ایک انوکھا خیال سوجھا۔ایک قدم آگے بڑھا،سر کو مزید جھکایا اور لہجے میں لجاجت پیدا کرتے ہوئے کہا۔حضور ایک نیا مشغلہ اختیار کیجیے۔روز تلوار سے سر قلم ہوتے دیکھنے سے بھی اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔پھر خلقت کم ہوتی جارہی ہے جس کا اثر خزانے پر بھی پڑرہا ہے۔نذرانے پیش کرنے والے اور خراج دینے والے کم ہورہے ہیں۔پھر قاضی بھی شتابی سے فیصلے کرکے فارغ ہوجاتا ہے۔قاضی کے پاس فرصت زیادہ ہو تو بیکار کی باتیں سوچتا ہے۔میرا مطلب ہے اپنی حد سے باہر کی باتوں پر دھیان دینے لگتا ہے۔مشیر اعلیٰ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

تفصیل سے کہو۔شاہی حکم صادر ہوا۔

حضور جرم کی سزا موت سخت سہی،مگر رعایا اسے اپنے حق میں بہتر سمجھنے لگی ہے۔حضور کو مملکت کی یہ رمز یاد دلانا جسارت ہے، پر کہے بنا چارہ نہیں کہ جو رعایا کے حق میں ہے، وہ بادشاہ کے خلاف ہے۔انھیں روز روز کی موت دیجیے۔قاضی کو مصروف رکھیے۔مجھے اجازت مرحمت کیجیے، میں اپنے ماتحت دو نئے مشیر مقرر کروں۔

اچھا خیال ہے، کچھ اور تفصیل۔

حضور کچھ لوگ اس لیے جرم کرنے لگے ہیں کہ انھیں یقین ہے کہ انھیں جناب کا مقرر کردہ قاضی فوراً موت کی سزا دے گا اور وہ اس دنیا کے بجائے اگلی دنیا کی عیش بھری زندگی کے حقدار ہو جائیں گے۔ رعایا کو جرم کے بجائے، جرم کرنے کی نیت کی سزا دی جائے اور ہر ایک کے لیے موت کی سزا مقرر نہ ہو۔ رعایا جرم کی نیت کیسے کرتی ہے، اس کے لیے نئے مشیر دن رات کام کریں گے۔ پہلے قاضی جرم کی شہادت اکٹھی کر کے یا جرم کا اعتراف سن کر فوراً فیصلہ کرتا ہے، اب وہ نیت کو دیکھے گا۔ نیت ہو تو جرم کسی بھی وقت کیا جا سکتا ہے۔

تم میرے مشیر اعلیٰ ہونے کا استحقاق رکھتے ہو۔ بادشاہ نے خوش ہو کر کہا۔

آخر دنیا کا سب سے بڑا دماغ ہی صحیح مشیر کا انتخاب کرتا ہے۔ مشیر اعلیٰ نے تملق سے کہا۔

اگلے چند دنوں میں قاضی کی مصروفیت بے تحاشا بڑھ گئی۔ قاضی نے پچھلے اور نئے زمانے پر غور کیا۔ پچھلے زمانے میں جرم کرنے والے زیادہ نہیں تھے، پر اب جرم کی نیت سے کوئی مبرا نہیں تھا۔ اسے لگا پہلے اسے سب صاف صاف نظر آتا تھا، مگر اب آگے صرف دھند تھی، جس میں اس نے قانون کی چھڑی سے راستہ بنانا تھا۔ یہ سب نئے مشیروں کے اعلیٰ ذہن کی بدولت تھا، جو پہلے ایک شخص پکڑتے، اس کے ہاتھ میں ایک پرچا تھماتے اور چوکنے سپاہی اسے قاضی کے پاس پہنچاتے۔ بادشاہ کی طبیعت پر بس ایک چیز بار گزری۔ اسے ایک بڑی جیل بنانا پڑی۔ پہلے مجرم قاضی کی عدالت سے سیدھے جلاد کے پاس پہنچتے تھے، اب انھیں جیل میں رکھنا ضروری سمجھا گیا۔ تاہم جب وہ جیل بھی بھر گئی اور بادشاہ کی طبیعت منغض ہوئی تو مشیر اعلیٰ نے اس کا حل بھی نکال لیا۔ ہر ماخوذ شخص کے گھر کو جیل قرار دے دیا گیا۔ بادشاہ مشیر اعلیٰ کی ذہانت اور خلوص کا ایک بار پھر قائل ہوا۔

بادشاہ نے دریافت کیا کہ رعایا کی روزی روٹی کے مسائل، چوری ڈاکے، عورتوں اور بچوں سے زیادتی کے واقعات اس کے لیے اکتاہٹ کا سبب تھے۔ اب کسی کو اپنی روزی روٹی کی فکر نہیں تھی۔ چوری ڈاکے اور زیادتی کے واقعات بھی نہیں ہو رہے تھے۔ سب ایک ہی فکر میں تھے کہ وہ

کیسے ثابت کریں کہ وہ آئندہ کبھی جرم نہیں کریں گے۔ یوں بھی وہ آئندہ کے بارے میں زیادہ سوچنے کے عادی نہیں تھے۔ انھیں اپنے آج سے فرصت ہی کہاں ملتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انھوں نے خود کو عجب الجھن میں گھرا پایا کہ وہ خود یہ کیوں نہیں جان سکتے کہ وہ کل کون سا جرم کریں گے۔

قاضی کی مانند بادشاہ کی مصروفیت بھی کافی بڑھ گئی تھی۔ اسے روزانہ دل چسپ واقعات سننے کو مل رہے تھے، جن میں کہانیوں سے زیادہ دل چسپی تھی۔ قاضی کے پاس جو مقدمہ آتا، اس کی ایک نقل بادشاہ کو بھیجی جاتی۔ ہر اس مقدمے کی روزانہ کی کارروائی بھی بادشاہ کے حضور پیش کی جاتی، جس میں بادشاہ کو خصوصی دل چسپی محسوس ہوتی۔ گزشتہ چند دنوں میں جن مقدمات میں بادشاہ کو خصوصی دل چسپی محسوس ہوئی، ان میں دو مقدمات قابل ذکر ہیں۔ پہلا مقدمہ ایک ایسے نوجوان کا تھا، جس پر الزام تھا کہ وہ بادشاہ کا تختہ الٹنے کی نیت رکھتا ہے۔ وہ ایک چرواہے کا نوجوان بیٹا تھا۔ وہ نہ تو اس شہر کا نام جانتا تھا جہاں بادشاہ کے محلات اور قاضی کی عدالت تھی اور نہ ہی بادشاہ کا پورا نام ادا کر سکتا تھا۔ اسے صرف اپنے باپ دادا اور بھیڑوں کے نام آتے تھے جو اس نے خود رکھے تھے۔ اسے جب گرفتار کر کے عدالت لایا جانے لگا تو اس نے سب بھیڑوں کو گلے لگانے کی اجازت مانگی تھی، جو اسے نہیں ملی۔ اس کا باپ اس کے ساتھ عدالت آیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ اس کے بیٹے کا جرم کیا ہے؟

یہ ایک ایسا جرم کرنے کی نیت رکھتا ہے، جس کی جرأت آج تک کسی کو نہیں ہوئی؟ مشیر عدالت نے سختی سے کہا۔

باپ اور بیٹا دونوں ڈر گئے۔

کیا اس نے تھوڑے عرصے میں بھیڑوں کی تعداد نہیں بڑھائی؟ دوسرا مشیر بولا۔

جی، اس نے بھیڑوں کو بھیڑیوں سے اور بیماریوں سے بچایا ہے۔ باپ لجاجت سے اور قدرے خوش ہو کر بولا۔

پھر بھی تم پوچھ رہے ہو کہ اس کا جرم کیا ہے؟ دوسرا مشیر گرجا۔
پروردگار کی قسم اس نے کسی کی ایک بھیڑ تک نہیں چرائی۔ باپ نے سر جھکا کر صفائی دیتے ہوئے کہا۔

تم بھولے کم اور چالاک زیادہ ہو۔ اس بار قاضی بولا۔ جونوجوان اپنے باپ کی وراثت پر راضی نہ ہو، وہ راضی بہ رضا کیسے ہوسکتا ہے؟ آج اس نے بھیڑوں کی تعداد بڑھائی ہے، کل اپنی طاقت بڑھائے گا۔ تمھارا بیٹا بھیڑیں ہی نہیں پال رہا، بادشاہ کا تختہ الٹنے کی نیت بھی پال رہا ہے۔

قاضی نے تمام بھیڑیں بحق سرکار ضبط کرنے اور نوجوان چرواہے کو عمر قید کی سزا دینے کا فیصلہ سنایا۔ بادشاہ اس انصاف پر پہلے کپکپایا پھر خدا کا شکرادا کیا۔

دوسرا مقدمہ ایک عورت کا تھا۔ وہ اپنی بستی میں سب سے خوب صورت نہیں تھی۔ اپنی بوڑھی ماں کے ساتھ رہتی تھی۔ کچھ زمینیں تھیں جن کی دیکھ بھال وہ خود کرتی تھی۔ بستی میں جب بھی کوئی ناجائز بچہ پیدا ہوتا وہ اسے اٹھالاتی اور کسی بے اولاد کو اسے اپنی اولاد بنانے پر راضی کرلیتی۔ اگر اس میں کامیاب نہ ہوتی تو خود پالتی۔ درجن بھر بچے، اس کے گھر میں پل رہے تھے۔ پہلے اس پر الزام تھا کہ وہ بستی میں ناجائز بچے پیدا کرنے کی حوصلہ افزائی کررہی ہے، اور بستی میں حرامیوں کی تعداد حلال بچوں سے بڑھتی جارہی ہے۔ تب قاضی نے اسے چھوڑ دیا تھا اور الزام لگانے والوں سے کہا تھا کہ وہ ان عورتوں اور مردوں کو پیش کریں جو ناجائز بچے پیدا کرتے ہیں۔ اس پر الزام لگانے والے چپ ہوگئے تھے۔ اب قاضی کے سامنے یہ مقدمہ آیا کہ یہ عورت خود ناجائز بچہ پیدا کرنے کی نیت رکھتی ہے، لہٰذا اسے سزادی جائے۔ پہلی نظر میں قاضی کو یہ سیدھا سادہ مقدمہ نظر آیا۔ جو عورت ناجائز بچے کی پرورش کرسکتی ہے، وہ ناجائز بچے کو جنم دے بھی سکتی ہے۔ جب عورت کو طلب کیا گیا تو معلوم ہوا کہ مقدمہ اتنا سادہ نہیں ہے۔ عورت نے قاضی سے کہا کہ بچہ پیدا کرنے کی میری نیت ہوسکتی ہے، لیکن کیا میں اکیلے بچہ پیدا کرسکتی ہوں؟

قاضی یہ سن کر حیران ہوا۔ اس کا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں تھا۔ پہلے اس مرد کو بھی اسی مقدمے میں ماخوذ کیا جائے، جس کی نیت میرے ساتھ ناجائز تعلق قائم کرنے کی ہو۔ عورت اس بے باکی سے بولی کہ قاضی کو کہنا پڑا کہ عدالت کے احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ جس مشیر نے اس عورت کا مقدمہ تیار کیا تھا، اسے کہا گیا کہ وہ اس مرد کو بھی عدالت میں پیش کرے، جس کی نیت اس عورت سے ہم بستری کی ہو۔ بس یہ وہ نکتہ تھا، جس سے بادشاہ کو اس مقدمے سے گہری دل چسپی پیدا ہوئی، اور اس عورت کو دیکھنے کی خواہش بھی۔ لیکن بادشاہ نے اپنی خواہش کو ملتوی رکھنا مناسب سمجھا اور مقدمے کی روزانہ کی کارروائی سننے کے لیے بے تاب رہنے لگا۔ مشیرِ اعلیٰ کو بلا کر ایک بار پھر داد دی کہ اس نے بادشاہ کی اکتاہٹ دور کرنے کا کیا عمدہ سامان کیا ہے!

مشیر نے پہلی مرتبہ سخت الجھن میں خود کو گھرا ہوا پایا۔ اب تک وہ جرم کی نیت اور خواہش کو ایک ہی چیز سمجھتا آیا تھا۔ اس نے ایک سادہ سا اصول بنایا تھا کہ ''میری خواہش ہی، دوسرے شخص کے یہاں جرم کی نیت ہے۔ چوں کہ میری خواہشیں لامحدود ہیں، اس لیے ہر شخص کے یہاں ہر طرح کے جرم کی نیت بھی موجود ہے''۔ وہ خوش تھا کہ ایک سادہ سے اصول نے اسے دنیا بھر کے انسانوں کو سمجھنے کے قابل بنا دیا تھا۔ اس سے اس کے دل میں یہ یقین بھی راسخ ہو گیا تھا کہ ہر شخص پیدائشی مجرم ہے۔ کسی بھی شخص سے کسی بھی طرح کے جرم کا ارتکاب ممکن ہے، آج، کل، پرسوں یا کسی بھی وقت۔ اگر وہ جرم نہیں کرتا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ وہ جرم کرنے کی نیت اور اہلیت نہیں رکھتا، بلکہ اس لیے کہ اسے جرم کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ موقعے کا نہ ملنا اس کے جرم کی نیت کو ختم نہیں کر سکتا۔ اس یقین سے اس کے ضمیر کو کافی اطمینان بھی محسوس ہوتا تھا، جب وہ کسی بھی شخص پر کوئی بھی مقدمہ دائر کرتا تھا۔ وہ سوچتا، اس نے جرم کو ہونے سے پہلے روکا ہے جو ایک عظیم نیکی ہے۔ وہ دن رات نیکیاں سمیٹ کو چین کی نیند سوتا تھا، لیکن آج اسے اپنی خواہش کا سامنا کرنے سے الجھن اور ڈر محسوس ہونے لگا تھا۔ یہ دونوں باتیں اس کے لیے نئی

تھیں۔اسے کسی کے جرم کی نیت تلاش کرنے میں کبھی ڈر محسوس ہوا تھا نہ کبھی کوئی الجھن ہوئی تھی۔بادشاہ مسلسل اور بے تابی سے اس مقدمے کی کارروائی سن رہا تھا۔اسے جلد سے جلد اس شخص کو تلاش کرنا تھا جس کی نیت اس عورت سے ہم بستری کی تھی۔لیکن اس کا اپنا ہی بنایا ہوا سادہ اصول اسے ڈر اور الجھن میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔'دنیا کے ہر اصول میں استثنا ہوتا ہے'اسے خیال آیا۔اس سے اس کی الجھن دور ہوتی محسوس ہوئی۔البتہ ڈر باقی تھا۔میرے بنائے گئے اصول میں استثنا یہ ہے کہ میری خواہش اور دوسرے کی نیت میں فرق ہوسکتا ہے۔لیکن جب اس نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اس خاص مقدمے میں یہ فرق کیا ہے تو اس کی الجھن پہلے سے بڑھ گئی۔بالآخر اس نے تسلیم کیا کہ وہ اپنی خواہش کو چھپانے کی کوشش کررہا تھا۔یہ کوشش ہی اس کے لیے مصیبت کا باعث بنی ہوئی تھی۔بالآخر اس نے یہ اعتراف کرنے ہی میں عافیت جانی کہ اس کے دل میں بھی اس عورت ہی سے نہیں، ہر جوان عورت سے ناجائز تعلق کی خواہش موجود ہے۔پہلی بار اسے اپنے عمل کے نیک ہونے پر شک ہوا۔اس نے کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کیں اور سب مردوں کو جنھیں وہ جانتا تھا، ذہن میں لایا۔سب کے یہاں اسے اس عورت سے ہم بستری کی نیت کا یقین ہوا۔ہر آدمی قتل کرسکتا ہے، مگر ہر آدمی ہر آدمی کو قتل کرنے کی نیت نہیں رکھتا۔اس نے سوچا، لیکن ہر شخص ہر عورت سے جنسی تعلق کی نیت رکھتا ہے۔وہ کس کا نام پیش کرے؟اب یہ ایک نئی الجھن تھی۔

دو دنوں بعد اس نے اس شہر کے تمام مردوں کے نام پیش کیے، جن میں مشیر اعلیٰ، خود اس کا، قاضی کا اور بادشاہ کا نام بھی شامل تھا۔

سنا ہے اس کے بعد پرانا نظام انصاف بحال کردیا گیا۔

ایک پرانی تصویر کی نئی کہانی

تصویر کے آدھے حصے کے غائب ہوجانے کا انکشاف اس زلزلے سے بڑھ کر تھا جو
پندرہ سال پہلے آیا تھا اور جس کے نتیجے میں آدھی سے زیادہ آبادی پہلے چھتوں اور صحنوں سے محروم
ہوئی اور پھر اس نے دریافت کیا کہ قہر، بربادی اور بے چارگی کیا ہوتی ہے۔ زلزلے کے بعد مہینے
بھر میں نئی چھتیں اور نئے صحن بن گئے تھے، البتہ بربادی کی یادداشت باقی رہی اور ان کے دلوں میں
ایک ان دیکھی طاقت کی ہیبت ابھارتی رہی جو کسی بھی وقت، کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی وجہ کے بغیر
انھیں برباد کرسکتی ہے، لیکن تصویر کے آدھے حصے کا اچانک غائب ہوجانا ایک ایسا سانحہ تھا جس کا
خیال انھیں کبھی نہ آیا تھا۔ یہ بات سانحے کو ان کی برداشت سے باہر بناتی تھی۔ انھوں نے صدیوں
کے تجربے سے سیکھا تھا کہ جو بات وہ سن چکے ہوں یا جس کا خیال ان تک پہنچا ہو، وہ ان کی
برداشت کی حد میں ہوتی ہے۔ بستی کے تین لوگوں کے ذمے بس یہ کام تھا کہ وہ سوچیں کہ اس بستی،
اس کے رہنے والوں، اس کے پرندوں، جانوروں، درختوں، گھروں کے ساتھ کیا کیا ہوسکتا
ہے، اور پھر سب بستی کو اپنے خیال میں شریک کریں۔ وہ ہفتے کے چھ دن سوچتے اور ساتویں دن
بستی والوں کو ہیبت ناک کہانیاں سناتے۔ اس سے سب لوگ ڈر جایا کرتے تھے اور کچھ تو رات بھر
سو نہ سکتے تھے، مگر اس بات پر بستی کے سردار سمیت بڑوں کا اتفاق تھا کہ جس بات کا خیال ڈر پیدا
کرے، اس کا سامنا ضرور کیا جائے۔ ایسی باتیں اندھیرے کی مانند ہوتی ہیں۔ اندھیرے کا ڈر

ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اس میں کچھ دکھائی نہیں دیتا، اور جہاں کچھ دکھائی نہ دے، وہاں کچھ بھی، غیر متوقع دکھائی دے سکتا ہے اور یہی بات خوف ناک ہے۔ سردار سمیت سب لوگ حیران تھے کہ کسی کے خیال میں یہ بات کیوں نہ آئی کہ تصویر کا آدھا حصہ کسی دن اچانک گم ہوسکتا ہے۔ وہ تین لوگ شرمندہ اور سہمے ہوئے تھے کہ ایسی کہانی ان کے خیال میں کیوں نہ آسکی جس میں کسی کا آدھا دھڑ اچانک گم ہوگیا ہو یا کسی بستی کے آدھے لوگ آناً فاناً غائب ہو گئے ہوں۔

وہ تصویر بستی کے لیے کس قدر اہم تھی، اس کا اندازہ انھیں پہلے بھی تھا، مگر وہ اس کے بغیر مفلوج ہو کر رہ جائیں گے، اس کا علم انھیں اب ہوا۔ یہ تصویر صدیوں سے چلی آتی تھی۔ اس کے بارے میں بس ایک ہی کہانی مشہور تھی، جس کی جزئیات پر تھوڑا بہت اختلاف تھا۔ یہ تصویر پہلے ایک غار کی اندرونی دیوار پر بنائی گئی تھی۔ دو لوگوں نے یہ تصویر بنائی تھی۔ وہ غار میں کیسے پہنچے، اس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ بس یہ معلوم تھا کہ انھوں نے پوری عمر صرف کر کے یہ تصویر بنائی تھی۔ ان کی عمر کے بارے میں اختلاف تھا۔ کوئی چالیس سال کہتا، کوئی اسی سال۔ کوئی سو سال۔ غار کے دروازے پر کچھ پرندے ہر وقت موجود رہتے، جو پھل اور میوے لایا کرتے۔ ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب تک غار میں رہے، کسی سے نہیں ملے۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے عمر کے جو بیس بائیس سال غار سے باہر کی دنیا میں گزارے تھے، اس کی یادداشت میں کسی کو خلل انداز نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے یادداشت اگر بے خلل رہے تو معجزے دکھا سکتی ہے۔ ان کی تصویر کو دیکھنے والے اس بات پر فوراً یقین کر لیتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ جیسے ہی انھوں نے تصویر مکمل کی، دونوں غار سے غائب ہو گئے۔ اس کہانی میں یقین کرنے والوں میں ایک گروہ کا خیال تھا کہ جیسے جیسے وہ تصویر مکمل کرتے، ان کے جسم تصویر میں تحلیل ہوتے جاتے۔ ادھر تصویر مکمل ہوئی، ادھر وہ دونوں غائب ہو گئے۔ دوسرے گروہ کا ماننا تھا کہ وہ کسی اور دنیا سے آئے تھے، صرف ایک مقصد کی خاطر، اس لیے جیسے ہی تصویر مکمل ہوئی،

وہ واپس چلے گئے۔ کئی صدیوں بعد یہ تصویر دوا اور لوگوں نے اس شیر کی کھال پر منتقل کی جس کی موت اس غار کے دروازے پر ہوئی۔ اگلی کئی صدیاں وہ تصویر ایک اور غار میں محفوظ پڑی رہی۔ اسے ایک چرواہے نے دریافت کیا۔ وہ چرواہا اس بستی کی پہلی اینٹ رکھنے والا تھا۔ اس کی چوتھی پیڑھی میں سے ایک شخص نے اس تصویر کو اس طویل وعریض 'کاغذ' پر منتقل کیا، جسے اس نے درخت کی چھال، پتوں اور کچھ پودوں کے ڈنٹھل پیس کر بنایا تھا۔ غار کی دیوار سے کاغذ پر منتقلی کے دوران میں تصویر میں کیا تبدیلیاں ہوئیں، اس بارے میں دو رائیں تھیں۔ ایک یہ کہ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کسی اور دنیا سے آنے والوں کی بنائی ہوئی تصویر میں کوئی تبدیلی کیسے کرسکتا ہے۔ دوسری رائے یہ تھی کہ ایک شے سے دوسری شے پر تصویر کی منتقلی، اس شخص کی پوری ہستی کی شمولیت کے بغیر ممکن نہیں۔ اس سے کبھی کبھی جھگڑا بھی ہوتا تھا، جس کا حل ایک تیسرے گروہ نے یہ کہہ کر نکالا کہ پہلی تصویر ہم میں سے کسی نے دیکھی ہی نہیں، اس لیے وثوق سے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ کیسی تھی۔ ہم صرف اس تصویر کے بارے میں وثوق سے کچھ کہہ سکتے ہیں جو ہمارے سامنے ہے۔ چوں کہ اس تصویر نے ہمیں اس بستی میں جینے کا ڈھنگ سکھایا ہے، اس لیے اسے اس ہستی نے بنایا ہے جو اس بستی میں رہنے والوں کے دلوں کے بھید سے واقف تھی۔ اس بات پر کبھی کبھی گفتگو ہوتی تھی کہ جب یہ بستی وجود ہی میں نہیں آئی تھی، اور اس میں بسنے والے پیدا ہی نہیں ہوئے تھے تو کوئی کیسے ان کے دلوں کے بھید سے واقف ہوسکتا ہے۔ اس کا جواب بستی کی ایک بوڑھی عورت دیا کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی۔ جب میرے بچے ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے، میں ان کی شکلوں اور مزاجوں کے بارے میں جان گئی تھی۔ اس بستی کی بھی کوئی ماں تو ہوگی۔ اس بوڑھی کی تکرار اکثر ایک نوجوان سے ہوا کرتی تھی جو ایک کسان کا بیٹا تھا اور زمینوں کی کاشت میں جس کا دل نہیں لگتا تھا۔ وہ کہا کرتا، ماں اپنے ہر بچے کے مزاج کے ساتھ ڈھل جاتی ہے، اس لیے اسے لگتا ہے کہ وہ ہر بچے کے مزاج سے اس کی پیدائش ہی سے پہلے واقف تھی۔ وہ

بوڑھی اسے ڈانٹ دیتی اور کہتی تم ماں کو صرف پالنے والی مخلوق سمجھتے ہو، جاننے والی نہیں۔ بستی میں کچھ اور بحثیں بھی اس تصویر کے تعلق سے ہوا کرتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ یہ تصویر ہماری روحوں سے مخاطب ہوتی ہے۔ اگر یہ باہر سے آئی ہے تو اس بستی کی روحوں سے کلام کیسے کر لیتی ہے۔ کیا خبر ہم اس سے کلام کرتے ہوں اور تصویر بس ٹکر ٹکر ہمیں دیکھتی ہو۔ کوئی سر پھرا کہتا۔ کوئی دوسرا اٹھتا اور کہتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری روحیں اس بستی کی مٹی سے پیدا ہوئی ہیں یا کسی اور مقام سے یہاں رہنے کے لیے وارد ہوئی ہیں؟ وہ طنزاً کہتا، کیسا ستم ہے کہ روح کے بارے میں وہ لوگ بھی بات کرتے ہیں جو ایک پہر چپ نہیں رہ سکتے۔ لیکن یہ بحث صرف چند لوگ ہی کیا کرتے تھے، اور اس کا اثر تصویر کی عام طور پر مشہور کہانی پر نہیں پڑتا تھا۔ وہ لوگ یہ بحثیں اس لیے بھی کیا کرتے کہ ان کا ذہن کہیں اور نہ بھٹکے۔ انھیں یقین تھا کہ جس دن ان کا ذہن اس تصویر سے بھٹک گیا اور اس سے ہٹ کر باتیں کرنے لگا، وہ اس بستی کی مخلوق نہیں رہیں گے۔

اس تصویر کو بستی میں ایک خاص مقام پر خاص طور پر تیار کیے گئے صندوق میں رکھا گیا تھا، جس کا ڈھکنا دن کو کھلا رہتا، مگر رات کو بند کر دیا جاتا۔ اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا کہ اس جگہ روشنی تو رہے، مگر تصویر پر نہ پڑے۔ اس جگہ کے درجہ حرارت کو بھی یکساں رکھا گیا تھا۔ وہاں ہر ایک کو آنے جانے کی اجازت تھی، مگر اسے ہاتھ کوئی بھی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس بستی کے سارے امور اس تصویر کی مدد سے چلائے جاتے۔ وہ چار فٹ چوڑی اور اتنے ہی فٹ لمبی تصویر تھی۔ اس میں شکلیں اور علامتیں تھیں۔ کسی مکمل انسان کی شکل اس میں نہ تھی۔ زاویہ بدلنے سے شکلیں اور علامتیں دونوں بدل جایا کرتیں۔ بستی میں سردار کا انتخاب کیسے ہوگا، اس کا فیصلہ تصویر میں موجود اس شکل سے کیا جاتا جسے دائیں طرف سے دیکھنے سے ہلال کی شکل بنتی اور بائیں طرف سے دیکھنے سے تلوار نظر آتی۔ اس کا سیدھا سادہ مطلب یہ تھا کہ بستی میں وہی شخص سردار ہوگا جس کا چہرہ روشن اور بازو مضبوط ہوں گے۔ ان دونوں باتوں کا فیصلہ ان کھیلوں سے ہوتا رہتا جو بستی میں مسلسل جاری رہتے۔ سردار کو

اختیار ہوتا کہ وہ بستی کے امن اور خوشحالی کے لیے فیصلے کر سکے اور لوگوں سے خراج وصول کر سکے۔ اگر سردار زیادتی کرتا تو اسے ہٹانے کا طریقہ بھی اسی تصویر میں درج تھا۔ اسی تصویر کے عین بیچ ایک علامت تھی، جسے بالکل سامنے کھڑے ہو کر دیکھنے سے وہ ایک ہرن کے سینگوں کی مانند نظر آتی تھی۔ اس کا مطلب سب کے نزدیک یہ تھا کہ ہٹائے جانے والے سردار کو کاندھوں پر بٹھا کر بستی سے باہر چھوڑ آنا ہے۔ کم از کم پانچ سال کے بعد اسے واپس بستی میں آنے کی اجازت تھی۔ کسی دوسری بستی سے جنگ کی صورت میں تصویر میں موجود اس شکل کو راہ نما بنایا جاتا جس کا چہرہ کچھ کچھ آدمی کا سا اور باقی دھڑ بھیڑیے کا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا پہلے دماغ کو استعمال کر کے بات چیت کی جائے پھر لڑا جائے۔ بستی کی کوئی مستقل فوج نہیں تھی۔ کھیلوں میں حصہ لینے والے تمام جوان لوگ جنگ کے سپاہی بن جایا کرتے۔ ہر گھر کے لیے ایک گھوڑا، ایک خچر، بیلوں کی ایک جوڑی رکھنی لازم تھی۔ بھالے، تلوار، خنجر اور دوسرے جنگی ہتھیار صرف سردار کے پاس ہوا کرتے۔

پورا ہفتہ خوف کی حالت میں بے بس رہنے کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ پہلے تصویر کے غائب حصے کا کچھ کیا جائے۔ لیکن پہلے یہ تو معلوم کرو کہ وہ حصہ غائب کیوں کر ہوا؟ سردار کے ایک قریبی مشیر نے سوال اٹھایا۔ سردار نے کہا کہ یہ وقت اس سوال کا نہیں۔ اگر ہم اس سوال کے جواب کی تلاش میں نکلیں گے تو ہمارے دل اس کے خلاف رنج، غصے اور انتقام سے بھر جائیں گے، جس نے یہ انہونی کی ہے۔ جسے ہم جانتے نہ ہوں، مگر اس کے لیے تشدد آمیز موت کے جذبات رکھتے ہوں، ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑتے، صرف اپنی شکلیں بگاڑتے ہیں اور روحیں مسخ کرتے ہیں۔ اس لیے سب نے فیصلہ کیا کہ تصور کے غائب حصے کو مکمل کرنے کا کوئی حل نکالا جائے۔

ایک بوڑھے کی رائے تھی کہ وہ تصویر سب کے حافظے میں ہے، اس لیے کوئی بھی مصور اسے مکمل کر دے۔ یہ بات اوّل اوّل سب کے دل کو لگی، لیکن جب ایک مصور نے بتایا کہ وہ ایک مقدس تصویر کی نقل کو دنیا کا سب سے بڑا پاپ سمجھتا ہے تو سب کے ماتھے ٹھنکے۔ اس مصور کا

یہ بھی خیال تھا کہ انسانی تخیل الوہی تصویر کی نقل کر ہی نہیں سکتا۔ الوہی تخیل کس طرح کام کرتا ہے اور اس کی حدیں کہاں کہاں ہیں یا سرے سے حدوں سے ماورا ہے، اسے انسانی عقل سمجھ سکتی ہے نہ انسانی تخیل۔ کچھ مورکھ یہ بات نہیں سمجھتے، اس لیے وہ الوہی تخیل کی نقل کی کوشش کرتے ہیں، جس کی سزا انھیں بھگتنا پڑتی ہے۔ وہ پہلے وحشت پھر جنون کا شکار ہوتے ہیں۔ اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ جتنے لوگ وحشت اور جنون میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کی وجہ لازماً الوہی مملکت میں جانے کی جسارت ہوتی ہے۔ اس نے اسی تصویر سے متعلق اپنا ایک خواب بھی سنایا۔ اس نے دیکھا کہ وہ تصویر چوری ہوگئی ہے۔ پوری بستی پر رات چھا گئی ہے۔ سب لوگ سو گئے ہیں۔ صدیاں گزر گئی ہیں۔ رات ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ پھر اچانک وہ تصویر خود بستی میں آن موجود ہوتی ہے۔ لوگ جاگتے ہیں تو ایک دوسرے کو پہچان نہیں پاتے۔ اس مصور کی باتیں اور خواب لوگوں کے پلے نہیں پڑا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ آدمی کو اپنی اوقات میں رہنا چاہیے، جس کا مطلب بھی اس نے بتایا کہ وہ بس الوہی تصویر کو دیکھے اور اس کے آگے سیس نوائے۔ لوگوں نے اسے خبطی اور جنونی قرار دیا اور اس سے مزید بات نہیں کی۔ دوسرے مصور نے ایک اور عذر پیش کیا کہ اسے صرف عورتوں کی تصویریں بنانا آتی ہیں کیوں کہ وہ عورت کے جسم کو دنیا کی تمثیل سمجھتا ہے۔ جو عورت کے جسم کے ایک ایک خط، قوس، دائرے، لکیر کو مصور کرنے کے قابل ہوتا ہے، وہ دنیا کو سمجھ لیتا ہے۔ جسے عورت سمجھ آ جائے اسے سب سمجھ میں آنے لگتا ہے۔

تیسرے مصور نے بتایا کہ وہ تصویر کا غائب حصہ بنا دے گا، مگر کم از کم دو لوگ اس کی مدد کرنے کو موجود ہوں۔ اس نے بتایا کہ جب وہ تصویر بنانے لگتا ہے تو ذہن میں موجود پرانی شکلیں غائب ہو جاتی ہیں۔ ایک بالکل نئی تصویر ذہن میں اچانک ابھرتی ہے، جسے وہ کینوس پر اتار دیتا ہے۔، جسے وہ اکثر خود بھی نہیں پہچان پاتا۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ دو لوگ کون سے ہوں جن کی یادداشت تصویر کے حوالے سے مکمل اور بے خطا ہو۔ پہلے تو سب یہی سمجھتے تھے کہ ہر

ایک کے حافظے میں وہ پوری تصویر محفوظ ہے، مگر جب سوچنے لگے تو معلوم ہوا کہ ایسا نہیں۔ سردار نے بستی کے دس لوگوں کو سامنے بٹھایا اور کہا کہ بتائیں غائب ہونے والے حصے میں کیا کیا تھا۔ یہ دیکھ کر سب کی گھگھی بندھ گئی کہ ان دسوں نے الگ الگ بتایا۔ کسی نے کہا کہ تین شکلیں اور چار علامتیں غائب ہوئی ہیں۔ کسی نے تعداد دوسری بتائی۔ اسی طرح شکلوں اور علامتوں کے سلسلے میں بھی رائیں مختلف تھیں۔ سب لوگ جب تصویر کے غائب حصوں کو یاد کرنے لگتے تو ان میں کچھ نہ کچھ ان چیزوں کی شکلیں شامل کر دیتے جو ان کی روزمرہ زندگی میں شامل تھیں۔ سردار کے لیے یہ بات اچنبھے کی تھی کہ کوئی بھی شخص تصویر کو اس کی اصل کے ساتھ یاد نہیں کر سکتا تھا۔ اسے یہ بات اس بستی کا سب سے بڑا فریب محسوس ہوئی اور حیرت بھی ہوئی کہ اتنی صدیوں سے پوری بستی فریب کے تحت جیتی رہی اور لاعلم رہی۔ سردار نے اس تصویر کے بارے میں پرانی کہانیوں کے سلسلے میں دل میں شک محسوس کیا، لیکن اس کا اظہار نہیں کیا۔

سردار کئی دن پریشان رہا۔ بالآخر چوتھے دن ایک عجب واقعہ ہوا۔ اسے اپنی پریشانی کا سبب اور حل ایک ساتھ معلوم ہوا۔ اس نے ایک نئے مصور کو بلایا جس نے اس تصویر کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے سمجھایا کہ تصویر کیسے مکمل کرنی ہے۔ جب مکمل تصویر بن گئی تو سب بستی والوں کو بلایا گیا۔ سب نے کہا کہ یہ تو بالکل وہی تصویر ہے۔ سردار کو دلی اطمینان ہوا۔ سردار نے رفتہ رفتہ اسی مصور سے ایک نئی تصویر پر کام شروع کروایا جس کا کچھ حصہ پہلی تصویر سے ملتا جلتا تھا۔ ایک رات اس نے پرانی تصویر کی جگہ نئی تصویر رکھوادی۔ جب وہ سردار مرا۔ نئے سردار کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا۔ تصویر کو دیکھا گیا تو دائیں طرف سے ہلال تو تھا، بائیں جانب سے تلوار نہیں تھی۔ سردار کا بڑا بیٹا روشن چہرے والا تھا، اس لیے وہی سردار چنا گیا۔ اس کے بعد سردار کے انتخاب کے لیے تصویر کو دیکھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوئی۔

''عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے، لاش کا نہیں''

اس کے جرموں کی فہرست طویل ہے، یہ تو ہمیں پہلے معلوم تھا لیکن یہ جرم اتنے سنگین ہوں گے، اس کا اندازہ ان کی زندگی میں ہمیں نہیں ہو سکا۔ جس قاضی نے زہر کے ذریعے اس کی موت کا فیصلہ لکھا، وہ بھی اس کے جرائم کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرنے سے قاصر رہا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر اسے یہ اندازہ ہوتا کہ اس نے کتنے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا ہے تو وہ اس کی موت کے لیے زہر کا انتخاب نہ کرتا۔ اسے اندازہ ہوتا بھی کیسے؟...لیکن اسے اندازہ ہونا چاہیے تھا...ٹھیک ہے اس نے دستیاب شواہد کی روشنی میں فیصلہ لکھا، لیکن اگر قاضی جیسا شخص بھی دستیاب شواہد کے پار نہ دیکھ سکے اور یہ نہ سمجھ سکے کہ ہر جرم میں لذت ہوتی ہے جو بعد میں عادت میں بدل جاتی ہے...تو اور کون سمجھے گا....اہل علم؟....انھیں تو آپس کے جھگڑوں سے فرصت نہیں.....خلیفہ؟ ....اس کے لیے جرم صرف وہی ہے جس سے اس کے تخت کو خطرہ ہو اور ان گناہ گار آنکھوں نے دیکھا ہے کہ ان کے تخت کے تین پائیوں کو انھی لوگوں نے سہارا دے رکھا ہوتا ہے جن کے کرتوتوں سے خلق خدا کی جان پر بنی ہوتی ہے۔ اسے بھی قاضی نے اس وقت طلب کیا تھا، جب خلیفہ کو اس کے جاسوسوں نے بتایا کہ اس نے شہر کے چوک میں اپنی نئی کتاب سے ایک صفحہ پڑھا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ جس کے کندھے پر لاکھوں جانوں کا بوجھ ہے، اسے رات کو نیند نہیں آتی۔ قاضی کو کہا گیا کہ وہ اس کی ساری کتاب پڑھے۔ قاضی نے بس اسی بات پر عمل کیا جو خلیفہ

نے کہی۔ اس کی دوسری کتابیں تو اب سامنے آئی ہیں۔ خدا کے نیک بندو، کھود ڈالو اس کی قبر، نکالو اس ملعون کو۔ ٹھوکریں مارو اس کے اس سر کو جو مجرمانہ باتیں سوچتا تھا، توڑ ڈالو ایک ایک انگلی جس سے مجرمانہ باتیں لکھتا تھا۔ روند ڈالو اس کے سینے کو جس میں ایک گناہ گار دل تھا۔

☆

عصر کا وقت تھا۔ نماز کے فوراً بعد خبر جنگل کی آگ سے بھی تیزی سے بستی میں پھیلی۔ سوائے دو لوگوں کے سب اشتعال میں آ گئے۔ سب کا رخ قبرستان کی طرف تھا جو بستی سے ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

چار اشخاص ایک قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ ابھی آگے نہ جاؤ، رکو۔ پہلے شیخ صاحب تقریر فرمائیں گے۔ وہ ان سب ہانپتے لوگوں سے کہہ رہے تھے جو ایک دوسرے سے پہلے پہنچنے کی کوشش میں تھے اور جن کے چہروں سے وہ ایمان افروز جلال نمایاں تھا، جس سے یہ بستی والے چند سال پہلے تک خود واقف نہیں تھے۔

"ہم نے مشکل سے اپنی بستی کو ان کے پلید وجود سے پاک کیا تھا۔ ہمارے بزرگ بڑے بھولے تھے، انھیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ روئے زمین پر ان سے بڑھ کر کوئی وجود ناپاک نہیں۔ انھوں نے انھیں یہاں رہنے کی اجازت دیے رکھی، ان کے ساتھ میل جول رکھا۔ انھیں اپنے گھروں میں آنے جانے، دکانوں سے سودا سلف خریدنے کی اجازت دیے رکھی۔ اس سے ان کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ خود کو ہم جیسا سمجھنے لگے۔ اکڑ کر چلنے لگے۔ انھوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوادی۔ بڑے عہدوں پر پہنچ گئے۔ ہمارے بڑے، بھولے تھے، یہ احمق نکلے۔ عہدہ بڑا ہوتا ہے یا عقیدہ؟ آگے حساب عہدے کا ہو گا یا عقیدے کا؟ بھائیو، مت بھولو، ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم لوگوں نے دنیا کی دولت، طاقت، عہدے، اختیار کے لالچ میں آ کر بدعقیدہ لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کیا کیا؟ ہم سب نے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے، ان سب کو اپنی بستی سے نکال دیا۔ الحمدللہ، ان کے

گھروں کو آگ لگائی تا کہ ان کے وجود کی طرح نجس ملبے کا نشان بھی مٹ جائے۔ہم نے ان کے ٹھکانوں کی جگہ نئے گھر بنائے، سوائے ایک گھر کے جسے عبرت کی خاطر چھوڑ دیا گیا ہے۔ان گھروں کی تقسیم پر ہم آپس میں لڑے، مقدمہ بازی بھی ہوئی۔ یہ سب ان کی بدروحوں کے اثرات تھے کہ ہم میں اتفاق نہ ہوسکا۔ان کی دکانوں پر ہم میں جھگڑا ضرور ہوا، مگر خدا کا شکر ہے کہ دو جانوں کی قربانی کے بعد ہمیشہ کے لیے وہ جھگڑا ختم ہوگیا۔اب وہاں اللہ کا گھر تعمیر کر دیا گیا ہے۔ان میں سے کچھ نے اپنا بدعقیدہ چھوڑ کر ہماری طرح صحیح العقیدہ ہونے کی پیش کش کی مگر ہم ان کے جھانسے میں نہیں آئے۔ ان کی ایک بڑی سازش کو ہم نے ناکام کیا۔ وہ اپنے چند لوگوں کو ہم میں شامل کر کے، ہمارے عقیدے خراب کرنا چاہتے تھے۔ہم نے بروقت ان کی توبہ میں ان کی بدنیتی کو بھانپ لیا۔ لاریب، خدا اپنے نیک بندوں کو گناہگاروں کی چالوں کو پہچاننے کی توفیق ارزاں فرماتا ہے۔ہم نے اب ان کی نئی چال کو بھی بھانپ لیا ہے۔وہ ہمارے قبرستان میں اپنا مردہ دفن کر کے واپس بستی میں آنے کا راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہم نہیں ہونے دیں گے۔اس سے زیادہ ان کے عقیدے کے غلط اور گمراہ ہونے کا ثبوت کیا ہوگا کہ انھوں نے رات کی تاریکی میں ہمارے قبرستان میں اپنے ایک پلید وجود کو دفن کیا۔ یہاں ہمارے بزرگوں کی نیک روحیں بستی ہیں۔ہم ان کو کیا جواب دیں گے؟ آؤ، اس ناپاک وجود کو اس پاک مٹی سے نکال باہر کرو۔''

شیخ صاحب کی تقریر ابھی جاری تھی کہ ایک بزرگ بولے۔''رات اور قبر سب عیب چھپاتی ہے، لیکن ایک بدعقیدہ وجود عیب تھوڑا ہے۔ پر ہم اُسے کیسے نکالیں گے؟ اسے ہاتھ کیسے لگا سکتے ہیں؟''

سب نے اس بزرگ کی تائید کی۔

''اس کا بھی حل ہے''۔شیخ صاحب ترنت بولے۔'' ہم اسے ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ جوان لوگ کفن کو پکڑ کر کھینچیں گے۔ بعد میں سات بار کلمہ شریف پڑھ کو خود کو پاک کرلیں گے''۔

''ہم اسے کہاں پھینکیں گے''؟

''کتوں کے آگے''ایک نوجوان جوش سے بولا۔

''ہماری بستی کے کتے بھی ناپاک ہوجائیں گے''۔ایک اورنوجوان زیادہ جوش سے بولا۔

اس پرقہقہہ پڑا۔

☆

اس کی جس کتاب کا جوصفحہ کھولتے ہیں، اس میں کفرہی کفر ہے۔ایک شیطان ہمارے درمیان موجودرہا،اورہم بےخبررہے۔اس کا دماغ آدمی کا تھاہی نہیں۔اتنا کفرایک شیطان کے ذہن ہی میں بھراہواہوسکتاہے۔شیطان سے زیادہ ذہین کون ہوگا؟...ذہین لوگوں سے زیادہ کوئی خطرناک نہیں ہوتا...جوخودسوچتاہے، وہ شرپھیلاتاہے۔خلیفہ اوراس کے دربارمیں موجودعالموں کے ہوتے ہوئے جوسوچتاہے، وہ شرپھیلاتاہے۔اس کے شرسے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے سوچنے ہی نہ دیا جائے....سنا ہے ایک دورکے ملک میں ایسے آدمی ہیں جواسی کی طرح کی باتیں کہتے ہیں۔آپ سب اس بات سے اتفاق کریں گے کہ یہ بھی وہیں سے آیا ہوگا یااس نے وہاں کی سیرکی ہوگی، جبھی وہ ہم سے مختلف تھا۔ہم نے غورکیا ہی نہیں کہ وہ کس کس سے ملتا تھا، کہاں کہاں جاتا تھا۔ہمارے خلیفہ نے بھی توظلم کیا،سب کے لکھنے پڑھنے کا انتظام نہیں کیا۔بس چارآدمی پڑھ لیے، باقی سب ان کی مجلس میں جاکران کی باتیں سن لیتے تھے....آپ ٹھیک کہتے ہیں خلیفہ کے لیے یہی مناسب تھا۔بس اپنا ایک خاص آدمی وہاں بٹھادیا۔سب معلوم ہوگیا کہ عالم کیا سوچتے ہیں،عوام کس بات کی تائید، کس کی تردیدکرتے ہیں....اگروہ چوک والا واقعہ نہ ہوتا تواس کی حقیقت کا پتا کس کو چلنا تھا....ویسے خلیفہ کی حکمت کی داددینی چاہیے۔اسے ایک عام سی بات سے،اس شیطان کے ذہن میں چلنے والی خاص بات کا پتا چل گیا۔خلیفہ اگراشارے نہ سمجھ سکے تواسے خلیفہ کون کہے اورکیسے وہ خلیفہ رہ سکے.....ابھی کل کی بات ہے، میں نے اس کی ایک کتاب کہیں سے حاصل کی....آپ ٹھیک فرماتے ہیں کفرکی طرف ہرآدمی کھنچتا ہے....مجھے

معلوم تھا کہ اس کی سب کتابوں میں کفر کی باتیں ہیں، مگر میرا دل... یا شاید میرا ذہن ان کی طرف کھنچا... شیطان کے فریب میں ہم ایسے ہی تو نہیں آتے... اس کی کتاب میں ایک حکایت تھی۔ ''ایک کوے نے دوسرے کوے سے پوچھا، ہم سب کالے کیوں ہیں؟ دوسرے کوے نے کہا: تو ضرور کسی ایسے دیس سے ہو کر آیا ہے جہاں سفید کوے بستے ہیں۔ پہلا بولا: تجھے کیسے معلوم ہوا؟ دوسرے نے جواب دیا: دوسروں کو دیکھے بغیر ہمیں اپنی اصل کا پتا نہیں چلتا۔ پہلے نے پوچھا، یہ علم تجھے کیسے حاصل ہوا؟ دوسرا بولا: میں اس دیس سے ہو کر آیا ہوں جہاں کے سب کوے سفید ہیں، مگر میں چپ رہا۔ پہلا اس بات پر بھی چپ نہ رہ سکا۔ پوچھا: تو اتنی بڑی بات جان کر کیسے چپ رہا؟ اس پر دوسرے کوے نے کچھ دیر خاموشی اختیار کی پھر گویا ہوا: میں نے پہلے آدھی بات بتائی۔ اب پوری بات سن۔ یہ سچ ہے دوسروں کو دیکھے بغیر ہمیں اپنی اصل کا پتا نہیں چلتا اور یہ بھی سچ ہے کہ دوسروں کو دیکھ کر ہم اپنی اصل پر شرمندہ بھی ہوتے ہیں، جیسے تو''۔ وہ ہمیں اپنی اصل پر شرمندہ کرتا تھا۔ ایسے بدطینت شخص کی لاش کو قبر سے نکال کر ہم نے نیکی کا کام کیا۔ خلیفہ کے حکم سے اس کی ساری کتابیں جمع کی جا رہی ہیں۔ ان کے بارے میں جلد ہی فیصلہ ہوگا۔

☆

ہر چیز کی قیمت ہوتی ہے۔ آپ مجھ سے اس لاش کی منہ مانگی قیمت وصول کر لیں۔

یہ تمھارا کیا لگتا ہے؟

کچھ نہیں، مگر بہت کچھ۔

تم اس بستی کے ہو، ہم تمھاری سات نسلوں کو جانتے ہیں، تمھیں اس سے کیا ہمدردی ہے؟

یہ آدمی نہیں لاش ہے۔ عقیدہ آدمی کا ہوتا ہے، لاش کا نہیں۔

تم گمراہ کر رہے ہو، یہ لاش اسی آدمی کی ہے جو بدعقیدہ تھا۔

ویسے تم اس کا کیا کرو گے؟

میں اسے کسی ہسپتال کو دے دوں گا، جہاں طب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ طالب علموں کا بھلا ہو گا۔

تم اگر اس بستی کے نہ ہوتے تو تمھیں اس قبر میں اس کی جگہ دفن کر دیتے، اسی وقت۔ شیخ صاحب گرجے۔ اس کے با وجود کو ہمارے ہم عقیدہ لوگ ہاتھ لگائیں گے؟ تم ہوش میں ہو؟

تم ایمان کے جس درجے پر اس وقت فائز ہو مجھے زندہ اس قبر میں گاڑ سکتے ہو، مان لیا۔ لیکن یاد رکھو، تم اسی طرح کی قبر میں یہیں کہیں آؤ گے۔

لیکن میں بدعقیدہ نہیں ہوں۔

اس کا فیصلہ تم نہیں، خدا کرے گا۔

خدا نے ہی ہمیں نیکی پھیلانے اور برائی روکنے کا حکم دیا ہے۔

ایک لاش کیا برائی پھیلا سکتی ہے؟

لاش ہے تو آدمی کی، جس کا عقیدہ....؟

تمھیں معلوم ہے، جس قبر پر تم کھڑے ہو کس کی ہے؟

کس کی ہے؟

ذرا قبر کی تختی پڑھو۔ یہ اسی کا رشتہ دار ہے جو پچاس سال پہلے مرا۔ اور بھی قبریں یہاں ان کی ہیں۔

ہم سب کو نکال پھینکیں گے۔ کچھ پر جوش جوان بولے۔

نکال پھینکو۔ اس سے بھی آسان حل ہے۔ ساری زمین کو بھی صحیح العقیدہ بنا لو۔ وہ بد عقیدہ کو قبول ہی نہ کرے تمھاری طرح۔

یہ چار جماعتیں پڑھ کر پاگل ہو گیا ہے۔ بھائیو، نکالو اس لاش کو اور اس کی بستی کے کتوں کے آگے پھینک آؤ۔

کچھ لوگ اس نوجوان کی طرف بڑھے۔ایک نے دھکا دیا۔ دوسروں نے اسے ٹھوکریں ماریں۔

☆

موت سے بڑی سزا کیا ہوسکتی ہے؟

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

موت سے بڑی سزا ہوسکتی ہے، لیکن وہ سب کے لیے نہیں ہوتی۔صرف ان کے لیے ہوسکتی ہے جنھوں نے زندگی بھر عزت کی آرزو کی ہو۔

ہم سمجھے نہیں۔

جو عزت کی آرزو کرتا ہے، وہ موت سے نہیں ڈرتا۔ جو موت سے نہیں ڈرتا، وہ ہمیشہ زندہ رہتا ہے۔

ہم اب بھی نہیں سمجھے۔

عزت دو چیزوں میں ہے۔علم میں اور عمل میں۔علم نافع اور عمل صحیح میں۔جس نے یہ دونوں حاصل کر لیے وہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا۔ جو ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا، اسے موت سے بڑی اور موت کے بعد بھی سزا ہوسکتی ہے۔

کچھ کچھ سمجھ میں آئی ہے تمھاری بات، آگے کہو۔

جن لوگوں نے اس کے علم سے نفع حاصل کیا، ان کی عزت برباد کردو۔ سزا اسے ہوگی جس نے وہ علم پیدا کیا۔

اس کی لاش کو ٹھوکریں مارنے سے کیا فائدہ؟

وہ ٹھوکریں، اس شخص کو نہیں، ان کے سینوں کو لگیں جنھوں نے اس کے علم سے نفع حاصل کیا۔ وہ بے عزت ہوئے۔انھیں موت سے پہلے اور موت سے بڑی سزا ملی۔

☆

یہ وہی چوک ہے جہاں اس نے کہا تھا کہ ''جس کے کندھے پر لاکھوں جانوں کا بوجھ ہو، اسے رات کو نیند نہیں آتی''۔ چند لوگ اس واقعے کے گواہ بھی موجود ہیں۔ شہر کے سب جوان اور کہن سال جمع ہیں۔ صرف چند لاچار بوڑھے گھروں میں رہ گئے ہیں، جنھیں ان کے جوان بیٹے اس واقعے کی تفصیل بتائیں گے۔ الاؤ روشن ہو چکا ہے۔ ابھی شام ہے اور سخت سردی کا موسم ہے۔ الاؤ کی گرمی سب کو پہنچ رہی ہے۔ خلیفہ کے دربار کے سب بڑے عہدے دار یہاں موجود ہیں۔ شہر کے ایک ایک گھر، ایک ایک کونے، ایک ایک کتب خانے کو چھان کر اس کی سب کتابیں جمع کی گئی ہیں۔ اس کے کچھ شاگردوں کی کتابیں بھی لائی گئی ہیں، جن کے بارے میں باقاعدہ تحقیق ہوئی ہے۔ کچھ شاگردوں نے توبہ کی ہے، مگر ان کی توبہ اس شرط پر قبول کی گئی ہے کہ وہ آئندہ ساری زندگی کوئی کتاب نہیں لکھیں گے، کسی مجلس میں گفتگو نہیں کریں گے۔ بقیہ زندگی صرف نیک لوگوں کی مجلس میں بیٹھ کر چپ چاپ بسر کریں گے۔ علما کی کسی بحث میں حصہ نہیں لیں گے۔ ایک درباری نے خلیفہ سے عرض کی کہ انھیں معاف کیوں کیا گیا ہے، خلیفہ خلافِ معمول طیش میں آنے کے بجائے مسکرایا اور کہا، معاف کہاں کیا ہے؟ اس سے کڑی سزا ان کے لیے کیا ہو سکتی ہے؟ درباری بھی بندر کی طرح مسکرا دیا، پر اسے پوری بات سمجھ میں نہ آئی۔ خلیفہ نے اپنے فرمان میں خاص طور پر یہ بات درج کروائی ہے تا کہ کوئی شک نہ رہے۔ جو شخص ایک بار دوسروں کی باتوں کو ماننے کے بجائے ان پر جرح کی عادت ڈالتا ہے، وہ اس سے باز نہیں رہ سکتا۔ (اس پر چوک میں کھڑے ایک شخص نے دوسرے سے سرگوشی کی۔ اب سمجھ آیا، اس کے شاگردوں کی سزا واقعی کڑی ہے)۔ ایسا شخص دین کی سچائی کے ساتھ ساتھ دنیا کے امن کے لیے بھی خطرہ ہوتا ہے۔ لہٰذا آئندہ کوئی شخص کسی عالم کی بات پر اور دربار کے حکم پر جرح کرتا پایا گیا تو اس کی سزا موت ہوگی..... پہلے خلیفہ نے فیصلہ کیا کہ پہلے ہر کتاب کا خلاصہ پڑھا جائے گا پھر اسے الاؤ میں پھینکا جائے گا، مگر پھر فیصلہ بدل دیا۔ کچھ کا خیال ہے کہ خلیفہ نے اس لیے فیصلہ بدلا کہ اسے لگا

ہو گا کہ اس طرح وہ کتابوں کو جلانے کا جواز پیش کر رہا ہے۔ خلیفہ اگر اپنے عمل کا جواز پیش کرنے لگا تو کر لی اس نے حکومت۔ بعض کی رائے تھی کہ خلیفہ ڈر گیا۔ اس طرح تو سب لوگ اس کی کتابوں میں بھرے کفر سے واقف ہو جائیں گے اور کون نہیں جانتا کہ کفر طاعون کی طرح تیزی سے پھیلتا ہے۔ جب کہ کچھ کا یہ بھی خیال تھا کہ خلیفہ نے ان کتابوں میں کچھ ایسے علما کی کتابیں بھی شامل کر دی ہیں جو اس کے مسلک کے نہیں ہیں۔ نوبت بجنے لگی ہے۔ ایک درباری اعلان کر رہا ہے کہ آج کی شام اس شہر کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ آج، بس تھوڑی ہی دیر بعد اس شر اور کفر کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا، جس سے اس شہر ہی کو نہیں آنے والوں کے دین وایمان کو بھی خطرہ تھا۔ ایک ایک کتاب اس الاؤ میں ڈالی جائے گی اور ہر کتاب کے جلنے کے ساتھ جشن منایا جائے گا۔ کفر کے خاتمے کو یادگار بنایا جائے گا۔ سب ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے، گلے ملیں گے۔ تاشے بجائے جائیں گے۔ شر پر فتح کے نعرے لگائے جائیں گے۔ آخر میں سب کی تواضع اس مشروب خاص سے کی جائے گی جسے خلیفہ اور اس کے خاص درباری نوش فرمایا کرتے ہیں۔

☆

ہم صرف اس لاش کو جلانا چاہتے تھے جو رات کے اندھیرے میں دفن کی گئی تھی، اسے نہیں۔ شیخ صاحب نے بوڑھے باپ کو دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ اس سے کوئی ہماری کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اسے ہم نے بہت سمجھایا مگر وہ ضدی نکلا۔ دین کے دشمن کے حق میں باقاعدہ جرح کرنے والوں کا انجام ہمیشہ سے یہی ہوتا آیا ہے۔ اس نے ایک دشمن کا ساتھ دے کر اپنے عقیدے کو بھی خراب کر لیا۔ ہم اب اس کی مغفرت کی دعا بھی نہیں کر سکتے۔ البتہ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ آپ کو صبر دے۔ آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ پانچ وقت ہمارے ساتھ نماز پڑھتے ہیں۔

سب سے پرانی قبر ہی پھانسی سے بچا سکتی ہے

جب میں قبرستان پہنچا ہوں تو پہلا احساس معمولی سی ٹھنڈک کا تھا۔ ون کا وہ درخت خاصا گھنا تھا، جس کے سائے میں بچھی ایک بوسیدہ اور پھٹی ہوئی صف پر آلتی پالتی مار کر میں بیٹھ گیا۔ میں جس راستے سے آیا تھا وہ یہیں ختم ہوتا تھا۔ آگے راستہ خود بنانا تھا۔ میں نے ایک نظر آس پاس ڈالی۔ چند ایک قبریں تھیں، جن کی حالت اچھی نہیں تھی۔ ان کے تعویذ آدھے سے زیادہ بھربھری مٹی میں بدل چکے تھے۔ کچھ میں گڑھے پڑ گئے تھے۔ ان قبروں کی ویرانی نے مجھے ایک نئے مگر عجیب احساس سے دوچار کیا۔ آدمی کی طرح اس کی قبر کی بھی موت ہوتی ہے۔

قبروں کی طویل قطاریں اس سے آگے تھیں۔ صف پر سیدھا لیٹ گیا اور کچھ دیر کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ کمر اور پاؤں دکھ رہے تھے۔ میں دونوں کی دکھن محسوس کرنے لگا۔ ذہن ادھر بھٹکنے لگتا، جس سے دکھن بڑھنے لگتی۔ کئی سالوں کے تجربے کے بعد مجھے یہ عام سی بات معلوم ہوئی ہے کہ جسم کی کسی بھی تکلیف کو اگر پوری طرح محسوس کیا جائے تو وہ خود بہ خود کم ہونے لگتی ہے یا کم از کم وہ قابل برداشت ہو جاتی ہے۔ میرے پاس وقت کم ہے اور کام زیادہ۔ لیکن اس لمحے میں نے ان دونوں باتوں کو دکھن محسوس کرنے پر اثر انداز نہیں ہونے دیا۔ ورنہ وقت مزید کم ہو جاتا اور میں یہاں جس کام کے لیے آیا ہوں، وہ پورا نہ ہو پاتا۔

ہونکنے کی آواز پر میں نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک مریل سا کتا ذرا فاصلے پر زبان

باہر نکالے ہونک رہا تھا۔ تھکاوٹ کافی حد تک اتر گئی تھی۔ ہم دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ شناسائی کا ایک کوندا سا لہرایا۔ اس ایک پل میں ہم ایک ہی طرح کی حالت میں تھے۔ دونوں کو سایہ اور آرام درکار تھا۔ لیکن قبرستان میں کتا کیسے آگیا؟ کتے بستیوں میں ہوتے ہیں۔ ویرانوں میں الو ہوسکتے ہیں یا کچھ خاص قسم کی سرمئی رنگ کی چڑیاں، فاختائیں ہوسکتی ہیں؟ میں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی تازہ جنازہ بھی نہیں آیا تھا۔ پھر یہ کتا یہاں کیسے؟ میں نے دائیں بائیں دور تک نظر دوڑائی۔ کوئی گھر، کوئی بھینی، کوئی آبادی موجود نہیں تھی۔ گورکن کا گھر بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ کیا یہ میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا؟ میرا اس سے کیا تعلق ہے؟ آدمی اور کتے کا کتنا گہرا تعلق ہے، میں اس پر زیادہ غور کرنے کا وقت اپنے پاس نہیں پاتا تھا، لیکن میں جلد سے جلد اس چھوٹے سے مسئلے سے نکل کر اپنے اصل کام کی طرف لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے پانی کی بوتل اٹھائی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے ایک ٹوٹا پیالہ وہاں مل گیا۔ اس میں کچھ پانی ڈال کر کتے کے آگے رکھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے چند گھونٹ بوتل منھ سے لگا کر بھرے۔ کھانا بعد میں۔ پہلے کام۔ میں نے خود سے اور کتے سے کہا۔

عصر کا وقت ہو رہا تھا۔ دھوپ گوارا ہوگئی تھی۔ ایک قبر کا سایہ دوسری قبر پر پڑ رہا تھا۔ میں نے بائیں طرف کی قبروں کی طرف چلنا شروع کیا۔ پہلی قبر کچی تھی۔ گہرے نیلے رنگ سے اس کی سفید لوح پر اس کے بارے میں لکھا تھا۔ وہ اسی سال کی عمر بسر کر کے یہاں پہنچا تھا۔ اس کا زمانہ دیکھا۔ ایک صدی پہلے۔ اگلی قبر بھی کچی تھی۔ وہ اس کی بیوی تھی جو اپنے شوہر کے دس سال بعد یہاں پہنچی تھی۔ دونوں کی عمریں البتہ برابر تھیں۔ کیسا اتفاق ہے! میں نے سوچا۔ آگے کی چند قبروں پر میں نے سرسری نگاہ ڈالی۔ اکثر قبریں کچی تھیں اور ان پر کتبے نہیں تھے۔ قبریں ہر عمر کے لوگوں کی تھیں۔ صرف بچوں کی قبریں چھوٹی تھی۔ کچھ تو محض لوندے کی چھوٹی سی ڈھیری تھیں۔ وہ قبریں لگتی ہی نہیں تھیں۔ کچھ پکی قبریں تھیں جن پر بڑے بڑے کتبے نصب کیے گئے تھے، اور کہیں

کہیں چار دیواری بنادی گئی تھی اور کچھ سبزہ اور پھول اگا دیے گئے تھے۔ کتبے ان کے بارے میں بس دو ایک سرسری باتیں بتاتے تھے کہ کب دنیا میں آئے اور کب انھیں یہاں لایا گیا؛ اس سے زیادہ یہ کتبے لگانے والوں کے بارے میں اشارہ کرتے تھے۔ لیکن یہ اشارے کون سمجھتا تھا؟ کتبے لگانے والوں کو یقین ہوگا کہ یہاں ان کے اشاروں کو سمجھنے والے موجود ہیں یا کبھی نہ کبھی آئیں گے، جیسے آج میں آیا ہوں۔ سارا قبرستان بس انھی دس بارہ قبروں کی نقل لگتا تھا۔ سورج غروب ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا تھا۔ میں نے پورے قبرستان کا چکر مکمل کرلیا تھا۔ میرا آدھا کام بھی مکمل نہیں ہوا تھا۔

میں اپنے دھیان میں سب کتبے لایا۔ وہ طرح طرح کے تھے۔ چھوٹے، بڑے اور خاصے بڑے۔ سفید مرمر کے۔ پکی مٹی سے بنے روغنی۔ اکثر کتبوں پر اشعار درج تھے۔ اشعار ملتے جلتے تھے۔ کچھ فارسی اشعار تھے، زیادہ تر اس زبان میں جو میں بولتا ہوں۔ کسی میں دنیا کی بے ثباتی پر زور تھا، کسی میں دنیا سے جلد چلے جانے پر رنج اور افسوس کا اظہار تھا۔ کچھ میں خدا سے شکوہ کیا گیا تھا۔ کچھ میں دعا دی گئی تھی۔ میں نے سوچا، زیادہ تر اشعار ایسے تھے جن کا اصل محل گھروں کی دیواریں تھیں جہاں ہر وقت نظر پڑتی ہے۔ ''یہی تو اصل بات ہے۔ پر سنتا کون ہے؟ چیخیں، شور مچائیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لگتا ہے سب بہرے ہوگئے ہیں۔ کل ایک عورت آئی۔ وہ اپنے دس سال کے بیٹے کی قبر کے سرہانے زار زار روئی۔ بی بی کیوں روتی ہو؟ یہاں نہ سہی کسی اور جگہ تم بھی بالآخر آہی جاؤ گی۔ یہ دن رات کا چکر ہے۔ سمجھو۔ یہ شام کے سائے کی طرح ہے جو چند ہی لمحوں میں رات میں گم ہو جاتا ہے۔ روئے وہ جس نے ہمیشہ رات دن کے چکر میں رہنا ہے۔ سب نے اس چکر سے نکل ہی آنا ہے۔ پر وہ بھی بہری تھی۔ اور اونچی آواز میں روتی رہی۔ پھر تھک ہار کر چلی گئی''۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا کوئی نہیں تھا۔ پر یہ کون تھا جو ایک نئی زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ میں، ہم دونوں کے بغیر۔ میں گھبرا تو گیا مگر یہ سوچ کر دل کو تسلی ہوئی کہ میں شام

کے سائے کے رات میں تحلیل ہونے سے پہلے چلا جاؤں گا۔ مجھے رات دن کے چکر سے نکلنے سے پہلے اپنا کام مکمل کرنا ہے۔ ''سب بے کار ہے۔ تم یہاں آ کر بھی نہیں سمجھ پا رہے۔ حیرت ہے۔ تف ہے!'' میں نے خود کو بہرہ تصور کیا اور اپنے کام پر توجہ مرکوز رکھی۔

سب سے کم عمر ایک دن کا بچہ تھا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ وہ لڑکا تھا یا لڑکی۔ کتبے پر اس کا کوئی نام درج نہیں تھا۔ میرے ایک دوست کی بچی پیدا ہوتے ہی چل بسی۔ اس نے مجھے روتے ہوئے کہا: جلدی سے کوئی نسوانی نام بتاؤ۔ میں سمجھ گیا مگر مشکل میں پڑ گیا۔ میں نے کہا اگر بچی کے ہمراہ کچھ روانہ کرنا ضروری ہی ہے تو نام کے سوا کچھ سہی۔ نام تو کمایا جاتا ہے، دہائیوں میں۔ دوسروں کی اچھی بری کمائی کیوں اس کے ساتھ بھیجتے ہو۔ وہ کچھ نہیں سمجھا۔ بس اصرار جاری رکھا۔ وہ اس کی قبر کو بے نشان نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ میں نے اللہ ڈیوائی بتا دیا۔ اللہ کی دی ہوئی۔ حالاں کہ یہ میری دادی کا نام تھا جو تیس پہلے دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔ میری دادی نے مجھے کبھی کہانیاں تو نہیں سنائیں، مگر مجھے اماں کے گزر جانے کے بعد پالا تھا۔ میں اور ابا دونوں اسے اپنی ماں سمجھتے تھے۔ دوست نے میرا بتایا ہوا نام قبول کر لیا تو میں نے سوچا: میری دادی کی اب دو قبریں ہیں..... پر اس کتبے پر بس اس کی تاریخ پیدائش درج تھی۔ لیکن جلد ہی عقدہ کھل گیا۔ اس بچے کی کوئی جنس نہیں ہوگی۔ ہوسکتا ہے اسے مار ڈالا گیا ہو۔ یہ کوئی انہونی نہیں تھی۔ میں نے اس طرح کے کئی واقعات سن رکھے ہیں۔ اس دنیا میں استقبال صرف لڑکے کا ہوتا ہے، مگر میں جس بستی سے یہاں آیا ہوں، وہاں کے کچھ لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالا گیا۔ کاش میرا باپ بھی مجھ پر اتنا رحم کرتا۔ کسی اور کے ہاتھوں مرنے سے اپنوں کی گود میں مرنا آسان ہے۔ اگر بے نام قبر والا بچہ چند سال تک باقی رہتا تو اسے یہاں قبر ہی نہیں ملنی تھی۔ گھر اور قبر سب کے لیے تھوڑی ہوتے ہیں۔ میں نے دیکھا کتا میرے آس پاس ہی منڈلا رہا تھا۔

سب سے زیادہ عمر ایک خاتون کی تھی۔ وہ ایک سو بیس سال کی عمر گزار کے یہاں پہنچی

تھی۔اس کے کتبے پر تاریخ کوئی پانچ سال پہلے کی درج تھی۔یعنی اس نے پچھلی صدی پوری، اس سے پہلی کی صدی کے پانچ سال اور اس صدی کے پندرہ سال دیکھے تھے۔ واہ۔ تین صدیاں۔میں کچھ دیر کے لیے اس خاتون کے قبر کے پاس رک گیا۔کتبے سے لگتا تھا کہ اس کے بچوں کے بچے نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔کتبے پر صرف دعا درج تھی۔ جب یہ مری ہوں گی ،ان کا چہرہ کیسا ہوگا؟ مطمئن یا ہڈیوں اور لکیروں کا ایک جال جس کا سرے سے کوئی مطلب ہی نہیں ہوتا۔اسی لمحے میں نے ایک شر رشر ر کی آواز سنی جو اس قبرستان میں شدت سے گونجی۔کتا ایک قبر کے سرہانے پچھلی بائیں ٹانگ اٹھا کر موت کر رہا تھا۔ مجھے تعجب نہیں ہوا،مگر الجھن سی ضرور محسوس ہوئی۔زمین کا ایک ٹکڑا قبرستان بن کر آخر کس کی ملکیت ہوتا ہے؟اس الجھن کا حل بس اس خیال میں نظر آیا کہ صرف انسانوں کی ملکیت تو بہ ہر حال نہیں۔مرنے کے بعد آدمی کیا ہوتا ہے، یہ کون بتا سکتا ہے؟

میں نے ایک بار پھر سارے قبرستان کا چکر لگایا۔کوئی دس قبریں میں نشان زد کر سکا۔ کتبوں کے مطابق سب سے پرانی قبر دو سو سال پہلے بنی تھی، جب کہ صاحب قبر کی عمر پچاس برس تھی۔قبر پر اس کی علمی فضیلت درج تھی۔وہ علوم ظاہری و باطنی کا عالم تھا۔وہ میرے مطلب کی نہیں تھی،مگر میرے کام میں یہ سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔میں جیسے ہی ان دس قبروں کو باری باری غور سے دیکھتا، وہ دو سو سالہ پرانی قبر میرے سامنے آن کھڑی ہوتی۔ایک بار تو جی چاہا کہ اس پر سے کتبہ اکھاڑ کر پھینک دوں اور اسے گیارھویں قبر شمار کروں،مگر اس میں دقت یہ تھی کہ وہ دیکھنے میں نئی لگتی تھی۔کچی تھی،مگر اسے کچھ عرصہ پہلے ہی لیپا پوتا گیا تھا۔شاید ہر سال محرم میں اسے باقاعدگی سے لیپا پوتا جاتا تھا۔ایک اور دقت بھی تھی، اگر اسے گیارھویں قبر شمار کرتا تو وہ سب بے معنی ہو جاتا جس کے لیے یہ سارا سفر میں نے کیا ہے۔اسے گیارھویں قبر شمار کرنے کے لیے اپنی بستی کی ساری تاریخ الٹ پلٹ کرنی پڑتی۔اتنا بڑا کام میرے بس میں تو نہیں۔میں نے اس قبر پر وہ صافہ ڈال

دیا جسے میں گرمی سے بچنے کے لیے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اب وہ کم از کم نظروں سے تو اوجھل رہے گی۔ میں نے خود کو تسلی دی۔ ان دس قبروں میں تین تو بالکل شکستہ ہو چکی تھیں۔ بس بھربھری مٹی کی ڈھیری نظر آتی تھیں۔ انھیں بے نشان ہونے سے بچانے کے لیے ٹوٹے برتنوں کی ٹھیکریاں وہاں رکھ دی گئی تھیں۔ باقی سات قبروں کے آدھے سے زیادہ حصے شکستہ تھے۔

مجھے اور تو کچھ نہیں سوجھا۔ میں نے ان تینوں قبروں پر پڑی ٹھیکریوں میں سے کچھ ٹکڑے جمع کرنے شروع کیے۔ احتیاط یہ کی کہ ہر قبر کی ٹھیکریاں الگ الگ رہیں۔ کل چھ ٹھیکریاں اٹھائیں۔ واپس ون تلے آیا۔ فوراً پلٹا اور ستر سالہ پرانی قبر پر سے اپنا صافہ اٹھا لایا۔ ان ٹکڑوں کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ ون کا سایہ گہرا ہونے لگا تھا۔ سامنے کتا واپس اسی جگہ بیٹھ چکا تھا۔ میں نے آدھی سے زیادہ روٹی اس کے آگے ڈال دی۔

اٹھا۔ دائیں طرف ایک پکی قبر کے تبے کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ پہلی نظر میں سب ٹھیکریاں ملتی جلتی تھیں۔ پرانی تھیں۔ ہر ٹھیکری کا ایک رخ نسبتاً واضح اور دوسرا رخ خاصا مٹیالا تھا۔ ظاہر ہے بارش کی وجہ سے۔ البتہ کچھ موٹی تھیں اور کچھ پتلی تھیں۔ ایک بار لگا کہ دو ایک ٹھیکریوں پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ غور سے دیکھا۔ ٹیڑھی میڑھی سی سطریں محسوس ہو رہی تھیں۔ میں نے انھیں ہر طرف سے دیکھا، اس خیال سے کہ انھیں پڑھ سکوں۔ عبارت سی تو محسوس ہوتی تھی، مگر کیا تھی، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس لمحے مجھے دو خیال آئے۔ پہلا یہ کہ وہ عبارت تو ہے پر آدمی کی لکھی ہوئی نہیں۔ بارش، ہوا، گرد، دھوپ وغیرہ نے ان ٹھیکریوں پر عبارت سی بنا دی ہے۔ اگر آدمی لکھ سکتا ہے تو عناصر کیوں نہیں؟ آدمی بھی تو انھیں عناصر سے بنا ہے۔ کون آدمی ہے جو یہ دعویٰ کر سکتا ہو کہ وہ جو بھی لکھتا ہے اس میں اس کے ارادے کے ساتھ عناصر شامل نہیں ہوتے؟ دوسرا خیال یہ آیا کہ کسی زمانے میں ان پر کچھ آدمیوں ہی نے کچھ لکھا ہوگا، جن کی زبان سے میں واقف نہیں۔ گویا ہے تو وہ کچھ نہ کچھ لکھا ہوا۔ اشاروں میں ہی سہی۔ میں انھی اشاروں

سے آگے بڑھ سکتا ہوں۔

میرے لیے یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ اس قبرستان میں سب سے پرانی قبر کس کی ہے۔ اگر میں ایسا نہ کر سکا تو میں پھانسی کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ یہ قبر ہی مجھے پھانسی سے بچا سکتی ہے۔ مجھے پھانسی سے ڈر نہیں لگتا کہ سن بلوغ کو پہنچتے ہی میں اس ڈر کا سامنا کر رہا ہوں۔ اتنے عرصے میں ڈر کے ساتھ جینے کا قرینہ آ ہی جاتا ہے مگر میں اپنے خاندان میں چلی آ رہی پھانسی کی سزا کا خاتمہ چاہتا ہوں۔ میری بستی کو جس حاکم نے فتح کیا تھا، اس نے حکم جاری کیا تھا کہ جن خاندانوں نے حاکم کی فتح کے دوران میں حاکم کا ساتھ نہیں دیا تھا اور اس کے سپاہیوں پر گولیاں چلائی تھیں، ان کے خاندان کی دس پشتوں میں سے سب سے بڑے بیٹے کو پھانسی دی جاتی رہے گی۔ اس بستی میں حاکموں کے خاندان بدلتے رہے ہیں مگر وہ قانون اب تک جاری ہے۔ حالاں کہ کئی دوسرے قوانین تبدیل ہوئے ہیں۔ نہیں بدلا تو موت کا قانون۔ میرا خاندان کافی بدقسمت واقع ہوا ہے، کیوں کہ اس خاندان میں ایک نہ ایک بیٹا پیدا ہوتا رہا ہے۔ باقی سب خاندانوں میں یا تو بیٹے پیدا ہی نہیں ہوئے، یا کچھ بے اولاد مر گئے، کچھ نے اپنے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی رات کی تاریکی میں کہیں پھینک دیا۔ پھانسی پانے والے سب لوگوں کو اسی قبرستان میں دفن کیا گیا۔ اسی حکم کا حصہ یہ تھا کہ ان کی قبروں پر کتبہ نہیں ہوگا۔

اب ان ٹھیکریوں ہی نے دو باتوں کا فیصلہ کرنا ہے۔ جن تین قبروں سے یہ اٹھائی گئی ہیں، ان میں سے ایک سب سے پرانی ہے، اور اس قبرستان کی پہلی قبر ہے۔ یہ ٹھیک اسی وقت بنی تھی، جب حاکم نے ہماری بستی فتح کی تھی۔ یوں سمجھیں اس قبرستان کی بنیاد میرے پرکھوں کی میتوں نے رکھی۔ دوسری یہ بات ثابت کرنی ہے کہ ان ٹھیکریوں پر جو عبارت سی ابھر آئی ہے، وہ کسی آدمی کے ہاتھ کی نہیں لکھی ہوئی۔ میرے خاندان کی نجات کا انحصار انھی دو باتوں پر ہے۔ ان دونوں میں سے ایک بات بھی ثابت ہوگئی تو دوسری خود بہ خود ثابت ہو جائے گی۔ پہلی بات کو ثابت کرنا زیادہ مشکل ہے۔ حاکم نے جس وقت ہماری بستی فتح کی تھی، اس وقت بستی میں بس

چار آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ پہلے انھی کے سر کاٹے گئے، حالاں کہ ان میں سے کسی نے ہتھیار نہیں اٹھائے تھے۔ حاکم کے ساتھ بھی چند ایسے لوگ تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ جب ہماری بستی کے پڑھے لکھے لوگوں کے سر کاٹے جا رہے تھے تو انھیں قریب کھڑے ہونے کا حکم ملا تھا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ یہ سننے اور سمجھنے کی کوشش کریں کہ سر کٹنے سے پہلے وہ کیا کہتے ہیں یا کیا ان کے منھ سے نکلتا ہے۔ جب جلاد نے تلوار نکالی تھی تو انھوں نے کاغذ قلم نکالے تھے۔ جیسے ہی بے سر کے دھڑ زمین پر گرے اور خون کی تیز دھاریں زمین پر شرر شرر بہنے لگیں، حاکم نے ان سے کاغذ لیے۔ جلدی جلدی انھیں پڑھا۔ سر اٹھا کر خشونت بھری نظروں سے ان منشیوں کی طرف دیکھا۔ کچھ دیر توقف کیا۔ فرمایا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہر مرنے والے نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ بات کہی ہو۔ تم سنتے ہو نہ دیکھتے ہو، اپنی طرف سے گھڑتے ہو۔ تخت سے اٹھ کر خیمے کی طرف جاتے ہوئے حاکم نے حکم صادر کیا کہ ان سب کو پانچ سال کے لیے ایک تاریک قید خانے میں رکھا جائے، جہاں نہ کچھ سنیں نہ دیکھیں۔

اپنے بوڑھوں سے پوچھیں تو انھیں اپنے بوڑھوں سے بس اتنا یاد ہے کہ وہ سب دو سردیوں تک بے گھر رہے تھے۔ ان کا گزارا بکریوں کے دودھ اور مرے ہوئے جانوروں کے گوشت پر تھا۔ ایک اور بات بھی وہ بتاتے ہیں کہ اس بستی کے ساتھ ایک نہر اس وقت کھودی گئی تھی، جب موجودہ خاندان اقتدار میں آیا۔ سن کسی کو یاد نہیں آتا۔ اب لے دے کے صرف دوسری بات ہی ثابت کرنا باقی ہے، اور میرا خیال ہے کہ میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔ لیکن مجھے اس طرح ثابت کرنا ہے جسے اور کوئی سمجھے نہ سمجھے حاکموں کا خاندان سمجھ سکے۔ اتنا تو میں جان ہی چکا ہوں کہ حاکم اپنے طریقے ہی سے سمجھتا ہے۔ میں نے کئی سال حاکموں کے طریقے سمجھنے میں صرف کیے ہیں، گو کامیابی کچھ کچھ ہوئی ہے۔

ابھی چند دن پہلے پوری بستی شام کے وقت اکٹھی ہوئی۔ حاکم نے بھی اپنے محل سے

دیکھا۔ شام ہو رہی تھی۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں، بادلوں کی ٹکڑیوں پر پڑ رہی تھیں۔ سب سے پہلے شاہی مسجد کے امام نے نشان دہی کی کہ سورج کی کرنیں آسمان پر ظل الٰہی کا نام لکھ رہی ہیں۔ نقارہ بجا۔ سب کو آگاہ کیا گیا تو سب نے امام صاحب کی تائید کی اور امام صاحب نے بتایا کہ ظل الٰہی کو الٰہی تائید حاصل ہے اس بستی پر حکمرانی کرنے کی۔ امام صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ عناصر قدرت نے یہ سب لکھا ہے۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ جب حاکم انصاف پسند اور رعایا پر مہربان ہو تو عناصر قدرت حاکم پر مہربان ہو جاتے ہیں۔ سب کو یقین آ گیا کہ امامت کا فریضہ امام صاحب کے خاندان میں رہے گا کہ وہ بادشاہ، رعایا اور قدرت تینوں کی زبان سمجھتا ہے۔ میں عناصر کی زبان تو نہیں سمجھتا مگر جس زبان کو حاکم سمجھتا ہے، اس کی شدھ بدھ مل گئی ہے۔

جو عناصر بادلوں پر لکھ سکتے ہیں وہ ٹھیکریوں پر بھی تو لکھ سکتے ہیں؟ دلیل ذرا شاہی مزاج کے خلاف ہے، مگر شاہی طریقے سے ملتی جلتی ہے، اس لیے مجھے یقین ہے کہ امام صاحب بادشاہ تک میری بات پہنچائیں گے۔ میں امام صاحب سے کہوں گا کہ وہ کہیں کہ بادشاہ کے لیے آسمان اور بادل ہی زیبا ہیں اور ہم جیسوں کے لیے ٹھیکریاں۔ یہ شاہی قانون کے عین مطابق ہے۔ بس ایک مشکل ہے کہ ٹھیکری پر میرے دسویں دادا کا نام ثابت کرنا ہے، جو مجھے یاد ہی نہیں۔ خیر، کوئی نام بھی ہوگا، اسے میں اپنے دادا کا نام ہی سمجھوں گا۔ امام صاحب کئی خطوں کا ذکر فرماتے رہتے ہیں۔ ابھی جب بادلوں پر ظل الٰہی کا نام لکھا گیا تھا تو اسے انھوں نے خط شکستہ کہا تھا۔ شاید عناصر قدرت کا خط ہے، ہی ہی!

اس سے پہلے کہ شام کے سائے رات میں تحلیل ہوں، مجھے یہاں سے جانا ہے، ورنہ مجھے وہ ٹھیکریاں یہیں قبرستان میں پھینک دینی ہوں گی۔

لکھنا بھی سزا ہے، پر آدمی ہونا بڑی سزا ہے

یہ شہر ان سب شہروں سے مختلف تھا، جن سے گزر کر وہ یہاں پہنچا تھا۔ یہاں کے لوگ نہ اندھے تھے، نہ بہرے گونگے، نہ لولے لنگڑے۔ تین طرف سے جنگلوں میں گھرے اس شہر میں وہ شام کے وقت پہنچا تھا۔ اس نے شکر ادا کیا کہ اس نے جنگل کا راستہ نہیں پکڑا تھا۔ ایک چوڑی کچی سڑک سے وہ جب شہر میں داخل ہوا تو پہلے اس کی تلاشی لی گئی، پھر اتا پتا معلوم کیا گیا، پھر آنے کا مقصد پوچھا گیا۔ سپاہیوں کی آنکھیں، ان کی زبانوں سے زیادہ سوال کرنے والی تھیں اور ان کی تاب لانا مشکل ہو رہا تھا۔ اسے یاد آیا وہ سب سے پہلے اندھوں کے شہر میں جا نکلا تھا۔ انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ اندھے ہیں، جب کہ اس شہر کے جن سپاہیوں سے ابھی اس کا واسطہ پڑا تھا، انھیں جیسے کسی غیبی طاقت نے بتا رکھا تھا کہ کسی خطرے کا مقابلہ کرنے میں آنکھوں سے بڑی طاقت آدمی کو دیوتاؤں نے نہیں دی۔ وہ ان کی مدد سے اس کی پوری ہستی اور اس کے معلوم و مخفی سب گوشوں کو ٹٹول رہے تھے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اندھوں کے شہر کے باسی نہیں جانتے تھے کہ دنیا میں ایسے شہر بھی ہیں جہاں آنکھوں والے رہتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ یہاں کے لوگ اپنے کانوں اور ناک سے وہ کام لیتے ہیں جو آنکھوں سے لیا جاتا ہے۔ وہ ہر شے کو اس کی آواز، آواز کے معمولی اتار چڑھاؤ سے پہچان لیتے تھے یا پھر چیزوں کی بو سے انھیں پتا چل جاتا کہ ارد گرد کیا ہے، کون آیا ہے، کون کیا کر رہا ہے۔ وہ سہ پہر کے وقت اندھوں کے شہر میں پہنچا

تھا۔ وہ ایک گلی سے گزر رہا تھا۔ اس کے ارد گرد تین لوگ جمع ہو گئے۔ کہنے لگے یہاں کے نہیں ہو، کہاں سے آئے ہو، کیا کام ہے؟ اس نے استعجاب سے تینوں کی طرف دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، ایک نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا: جب تک ہمارے سوال کا جواب نہیں دو گے، ہم تمھیں ایک قدم آگے نہیں جانے دیں گے۔ وہ بولا: میں مسافر ہوں، تھک گیا ہوں۔ بس ایک رات گزارنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔

تم نے کیسے پہچانا کہ میں یہاں کا نہیں ہوں۔ جب تینوں کو اس پر اعتبار آ گیا تو اس نے پوچھا۔

تمھارے بدن کی بو سے۔ ایک بولا۔

میں سمجھا نہیں۔ اس کی حیرت بدستور قائم تھی۔

تم جہاں سے آئے ہو وہاں کی بو تمھارے ساتھ ہے۔ دوسرا بولا۔

پھر تم نے مجھے ایک رات قیام کی اجازت کیسے دی؟ اس نے تیسرے سے پوچھا۔

آدمی کی ایک اپنی بو بھی ہوتی ہے۔ تیسرا بولا۔

تم پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ اس نے کہا۔

اس بو کا مرکز تمھارے وجود کا خاص مقام ہے جسے تم بھی نہیں جانتے۔ اس بو کو صرف دوسرے ہی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ بو اصلی ہوتی ہے، مگر اس کی پہچان ذرا دیر سے ہوتی ہے، مگر ہمارے لیے اسے پہچاننا زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ خیر، اسے پہچان کر ہم نے تمھیں اجازت دی۔

کیا سوچ رہے ہو؟ سپاہیوں کی آنکھوں اور زبان نے بہ یک وقت سوال کیا۔

میں یہ سوچ رہا ہوں کہ تمھارے شہر کے تین طرف جنگل ہے۔

تم یہ نہیں سوچ رہے؟ تمھاری آنکھیں تمھاری زبان کا ساتھ نہیں دے رہیں؟

میں تم سے ڈر رہا ہوں۔ اس نے ایک سپاہی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

اب تم نے سچ بولا۔ اس سپاہی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

میں بس چند دن یہاں رکنا چاہتا ہوں۔ مسافر ہوں۔ بس دنیا کو دیکھنے کی ہوس ہے۔

ٹھیک ہے، جاؤ اجازت ہے، مگر ایک شرط ہے جو تمھیں خود معلوم ہو جائے گی۔

اسے ایک سرائے میں قیام کی اجازت ملی جو شہر کے آخری کونے میں تھی۔ وہ چلتے چلتے گونگے بہروں کے شہر کے بارے میں سوچنے لگا، جہاں وہ بس ایک رات گزار پایا تھا۔ اسے یاد آیا وہاں کی حیرتیں دوسری قسم کی تھیں۔ وہاں کے رہنے والوں نے اشاروں سے وہی سوال کیے جن کا سامنا اسے اندھوں کے شہر میں ہوا تھا۔ اسے اشاروں کی زبان سمجھنے میں وقت نہیں لگا مگر خود اشاروں سے انھیں سمجھانے میں اسے خاصی پریشانی ہوئی۔ وہ ہاتھ کو طرح طرح سے حرکتیں دے کر انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا کہ وہ کہاں سے آیا ہے۔ وہ اس کی حرکتوں پر ہنستے، غصے میں آتے، اس کی طرف بڑھتے، پھر مزید اشاروں سے اس سے پوچھتے کہ وہ کیوں اور کہاں سے آیا ہے؟ اصل پریشانی یہ تھی کہ اس کے ہاتھوں، کندھوں، آنکھوں کی ہر ہر حرکت، یہاں تک کہ اس کے چلنے کے انداز کا بھی کوئی نہ کوئی مطلب تھا۔ وہ تو صرف لفظوں کے مطلب سے واقف تھا۔ اسے لگا کہ وہ ہر ہر زاویے سے دیدہ و نادیدہ نگاہوں کی زد میں ہے۔ اسے اپنے ننگے پن کا بدترین احساس ہوا۔ وہ اس احساس سے کبھی گزرا نہیں تھا۔ یہ جسم کے سرِعام ننگے ہونے کے احساس سے بڑھ کر تھا۔ اسے لگا جیسے اس کے دل، دماغ، روح سب کی ایک ایک چیز بیچ بازار ننگی ہوگئی ہو۔ وہ اس طرح کی صورتِ حال سے واقف تھا، نہ اس سے نمٹنے کے کسی طریقے سے۔ جسم کے ننگے پن کو کپڑے یا خود جسم کے کچھ حصوں کی مدد سے وقتی طور پر ڈھانپا جا سکتا ہے، مگر دل، دماغ، روح کے ننگے پن کو؟ اسے شدید اکائی محسوس ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ بے حد ڈر گیا۔ اس سے عجیب و غریب حرکتیں سرزد ہو رہی تھیں۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں ہو پا رہا تھا کہ کس حرکت کا کیا مطلب ہے۔ تھک ہار کر وہ ایک چبوترے پر لیٹ گیا جو ایک دکان کے آگے بنا تھا۔ سب پیچھے ہٹ گئے۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بھوکا پیاسا صبح تک پڑا رہا۔ صبح کے وقت جب اس کی

آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر اس کی حیرت انتہا کو پہنچ گئی، جب اس کے کان میں ایک شخص نے سرگوشی کی۔ جلدی چلے جاؤ، کسی نے تمھیں بولتے دیکھ لیا تو مارے جاؤ گے۔ تم رات کو کچھ بڑبڑا رہے تھے، جس سے صرف مجھے پتا چلا کہ تم بولنا جانتے ہو۔ اس نے پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا تو وہ شخص تیز تیز بولا۔ یہاں کا راجا گونگا بہرا ہے۔ اس لیے سب پر لازم ہے کہ سب گونگے بہرے بن کر رہیں۔ اس کے جاسوس کتوں کی طرح یہاں ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ خود ضرورت پڑنے پر بھونک لیتے ہیں مگر کسی کو اور کو بھونکتے سن لیں تو وہیں کتے کی موت مار ڈالتے ہیں۔

وہ جب سرائے میں پہنچا ہے تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔

چند روز کے قیام سے اسے اس شہر کی کہانی معلوم ہوگئی جو باقی شہروں کی کہانی سے مختلف تھی۔ ایک زمانہ تھا جب اس شہر کے بادشاہ کے جاسوس ہر گھر میں موجود تھے۔ ہر شام کسی نہ کسی گھر کے کسی فرد کو پھانسی ملتی یا زبان کاٹ دی جاتی یا ہمیشہ کے لیے قید کر دیا جاتا۔ اگر کوئی ایک وقت کی روٹی نہ ملنے کی شکایت خدا سے کرتا تو اگلے دن اسے یہ کہہ کر لٹکا دیا جاتا کہ جاؤ سیدھے خدا سے شکوہ کرو۔ کوئی اپنی بیماری کے سبب پریشانی کا اظہار کرتا تو اس کی زبان کاٹ دی جاتی۔ دو شخص سرگوشی میں بات کرتے تو انھیں کنویں میں لٹکا دیا جاتا یا اس سے بڑی سزا دی جاتی اور اگر کوئی شہر میں بے امنی کا ذکر کر دیتا تو اسے تاریک قید خانے میں اس جگہ رکھا جاتا جہاں لوگوں کی سزا یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے سے اس وقت تک لڑیں جب تک دونوں میں سے ایک ہوش وحواس سے نہ جاتا رہے۔ قید خانے میں مرنے مارنے پر البتہ سخت پابندی تھی۔ پھر ایک وقت آیا جب سب گھروں سے ایک ایک شخص نکلا اور انھوں نے بادشاہ کے خلاف جلوس نکالا۔ انھوں نے اپنے گلوں میں رسے لٹکائے ہوئے تھے۔ وزیر کبیر نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ ان کی سزا بدل دیں۔ چناں چہ جلوس کا شاہی استقبال کیا گیا۔ ہر گھر میں موجود جاسوس سے اس کی ذمہ داریاں واپس لے لی گئیں۔

اگلے ہی دن شہر میں ایک بڑی دیوار کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ کچھ ہی دنوں میں پچاس فٹ

اونچی، سوفٹ چوڑی سنگی دیوار تیار ہوگئی، اور اس پر اتنے ہی خانے بنا دیے گئے جتنے شہر میں گھر تھے۔ شہر کے ہر بالغ شخص سے کہا گیا کہ وہ اس دیوار پر اپنے متعلقہ خانے میں روزانہ کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ وہ جو کچھ لکھے گا اس کا کوئی نہ کوئی مطلب بھی ہو۔ ایک بار لکھی گئی بات دوبارہ نہیں لکھی جائے گی۔ ہر روز لکھی گئی عبارات کو بادشاہ کے کارندے محفوظ رکھیں گے۔ حکم دیا گیا کہ سزا نہ لکھنے کی ہوگی، لکھنے کی نہیں۔ اس سے لوگوں کی یہ پریشانی تو دور ہوگئی کہ وہ کیا لکھیں کیا نہیں لیکن ان کا ڈر نہیں گیا۔

پہلے چند ان انھوں نے اقوال، کہانیاں، حکایتیں لکھیں۔ یہ سب لکھتے ہوئے وہ کافی احتیاط سے کام لیتے۔ انھیں لگتا کہ کوئی ہے جو ان کے ہر لفظ کے ہر ہر ممکنہ مطلب پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس سے انھیں ڈر، بے بسی، جوابدہی کا مسلسل احساس ہوتا۔ وہ یہ کوشش کرتے کہ حکایتوں میں کوئی نام نہ آنے پائے۔ اسی طرح کسی کردار کے عمل کا ذکر بھی عمومی انداز میں کرتے۔ اس نے کچھ حکایات سننے میں دل چسپی ظاہر کی تو ایک حکایت اسے کافی دل چسپ لگی۔ ''ایک مکڑی نے مکھی کو نگلنے سے پہلے پوچھا۔ اگر تم مکڑی ہوتی اور میں مکھی تو تو کیا کرتی؟ مکھی بولی، میں مکھی کو اتنی اذیت نہ دیتی۔ مکڑی نے کہا، میں سمجھی نہیں۔ مکھی بولی تم مجھ سے یہ بات پوچھ کر مجھے جو اذیت دے رہی ہو، یہ اس تکلیف سے بہت زیادہ ہے جو مجھے تم اچانک نگل کر دیتی۔ جو اپنے انجام کو جان لے وہ مرنے سے پہلے مر جاتا ہے''۔ کیا اس حکایت پر مصنف کی پرسش نہیں ہوئی؟ اس نے سرائے میں مقیم ایک شخص سے پوچھا۔ ''جہاں آدمی خود اپنے ایک ایک لفظ کی پرسش خود کر رہا ہو، وہاں کسی اور کی پرسش کی کیا ضرورت ہے؟'' کچھ دنوں بعد اس مصنف نے خودکشی کر لی۔

اس مصنف کی خودکشی کے بعد لوگوں نے حکایات لکھنی کم کر دیں۔ پھر ختم کر دیں۔

لکھنا لازم تھا، اس لیے کچھ نے ڈرتے ڈرتے وہ لکھنا شروع کیا، جس پر پہلے انھیں سزائیں دی جاتی تھیں۔ اس نے ان سزاؤں سے متعلق جاننے میں دل چسپی ظاہر کی۔ سزا کی

ایک کہانی، کہانیوں سے بڑھ کر دل چسپ لگی۔ ''میرا ایک ہی بیٹا تھا۔ وہ رات کے وقت اپنی بیوی سے کچھ سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ کسی بات پر پہلے دونوں سنجیدہ ہوئے، پھر ہنس پڑے۔ اگلی صبح اسے دربار میں طلب کیا گیا۔ بیویاں راز و نیاز کے لیے نہیں، کسی اور کام کے لیے ہوتی ہیں۔ اسے جرم سنا دیا گیا، ساتھ ہی سزا بھی۔ تم اپنی بیوی کے سامنے، قیدی خواتین سے وہ کام کیا کرو گے جو تمھیں بیوی سے کرنا تھا''۔

سزاؤں کی کہانیاں بھی بالآخر ختم ہوگئیں۔ اب انھیں احساس ہوا کہ لکھنا، بولنے سے بڑی سزا ہے۔ صرف یہی نہیں، وہ پہلی مرتبہ اس بات سے واقف ہوئے کہ دنیا میں ایک سزا ایسی بھی ہے جو زبان کے خاموش کر دیے جانے، قید اور یہاں تک کہ موت سے بھی بڑی ہوتی ہے۔ وہ باقی سب بھول بھال گئے۔ بیوی بچوں کا خیال، روزی روٹی کی فکر، باہم مل کر بیٹھنے، راتوں کو بے مقصد جاگنے، شادی غم۔ ان کا سارا دن اس فکر میں گزر جاتا کہ وہ کیا لکھیں۔ اتنی باتیں وہ کہاں سے لائیں۔ ایک دوسرے سے پوچھتے۔ راتوں کو اچانک اٹھ بیٹھتے اور وہاں سے بھاگ جانے کی تدبیر کرتے، مگر پہرے داروں کے ڈر سے بستر پر لیٹ جاتے اور خود کو گالیاں دیتے۔ سب کا دکھ مشترک تھا اور سب کسی حل کی تلاش میں تھے۔ پھر ایک شخص کو حل سوجھا۔ حل انوکھا تھا مگر کسی نے اس کے انوکھے پن کو محسوس نہیں کیا، کچھ اور چیزیں محسوس کیں۔

اس نے اگلے دن دیوار پر اپنی مرحومہ ماں کے فرضی معاشقے کا قصہ لکھنا شروع کیا۔ اسے یہ قصہ گھڑنے میں ذرا مشکل نہیں ہوئی۔ اس نے جب یہ سطر لکھی کہ ''وہ سات یا آٹھ سال کا ہوگا، جب ایک دن دوپہر کے وقت اس نے دیکھا کہ اس کی ماں نے اپنے عاشق کو گھر بلایا ہے'' تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل میں اپنی ماں کے خلاف حقیقی اور اس کے فرضی عاشق کے خلاف فرضی نفرت پیدا ہوئی۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ ماں کے خلاف حقیقی نفرت کو دل کے کسی کونے میں چھپا رہا تھا اور اس کے فرضی عاشق کے خلاف فرضی نفرت کو ظاہر ہونے دے رہا

تھا۔جس شام وہ دیوار پر اس قصے کی تیسری قسط لکھ رہا تھا آدھے سے زیادہ شہر وہاں جمع تھا جو دل چسپی سے اس قصے کو پڑھ رہا تھا۔اس نے پیچھے مڑ کر مجمعے پر نظر ڈالی اور رندھی ہوئی آواز میں کہا: ماں ایک عورت بھی ہوتی ہے، اسی طرح کی عورت جس کا خیال تم سب کو رات بستر پر جاتے ہی آنے لگتا ہے۔ وہ جیسے ہی قصہ مکمل کر کے سیڑھی سے اترا، وہاں صرف ایک شخص موجود تھا، اس کا چھوٹا بھائی۔ جاؤ، تم بھی اپنی سزا جھیل آؤ۔ وہ سیڑھی چڑھا اور اس نے بڑے بھائی کی بیٹی اور اپنی سگی بھتیجی کے فرضی معاشقے کا قصہ لکھنا شروع کر دیا۔اب اس کے جوان بھتیجے نے اس کی بیٹی اور اپنی چچازاد کے اپنے ساتھ فرضی معاشقے کا قصہ اپنے والد کو سنایا۔ رفتہ رفتہ سب لوگ اس نسخے پر عمل کرنے لگے۔ کچھ ہی دنوں میں پورے شہر میں ہر شخص ہر اس شخص سے نفرت کرنے لگا جس سے اس کا کوئی تعلق تھا یا کبھی رہا تھا۔سب نے محسوس کیا کہ مرے ہوؤں اور گم شدہ لوگوں سے نفرت زیادہ قوی ہوتی ہے، لیکن اس کا اظہار کرنے سے انھیں کچھ حجاب اور کچھ ڈر سا محسوس ہوتا تھا۔ادھر یہی حجاب اور یہی ڈر ان کے فرضی قصوں کو زیادہ دل چسپ بناتا تھا۔ شہر کے لوگ مطمئن تھے کہ کم از کم اس فکر سے آزاد ہوئے کہ انھیں اب روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنے کا نسخہ ہاتھ آ گیا تھا۔ان کے اطمینان کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نسخے سے کچھ اور نسخے بھی انھیں سوجھنے لگے تھے۔

شہر کا ہر شخص دن کے وقت ہر اس شخص کو کاٹ کھانے والی نظروں سے دیکھتا جس سے اس کا کوئی بھی تعلق تھا۔البتہ جو لوگ مر گئے تھے یا مفقودالخبر ہو گئے تھے ان کا خیال آتے ہی وہ دانتوں کو کچکچاتے۔ایسے میں انھیں لگتا جیسے وہ اپنے بھیجے کو اپنے دانتوں میں چبا رہے ہیں۔اس سے ان کے دل میں کچھ حجاب اور کچھ ڈر نئے سرے سے پیدا ہوتا۔ان کی راتوں کی صورت حال دوسری تھی۔آدھی رات کو اٹھ بیٹھنے کا سلسلہ پہلے کی طرح برقرار تھا۔خواب بدل گئے تھے۔لوگوں نے دیکھا کہ اس دیوار پر لکھنے والوں کی قطار ہر وقت لگی رہتی ہے، اور سب جلدی میں ہیں، جیسے دیر ہو گئی تو کچھ ہاتھ سے پھسل جائے گا۔ وہ سب دیوار پر اپنے خواب لکھنے لگے۔ یہ حکایتوں سے

دل چسپ اور فرضی معاشقوں کے قصوں کے مقابلے میں انوکھے تھے۔ جب وہ خود انھیں پڑھتے تو یقین نہ آتا کہ یہ سب انھوں نے لکھا ہے۔ دیوار پر ایسے ایسے جانوروں کے نام لکھے جانے لگے جو لوگوں نے خود کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔ ان کی شکلیں بھی عام جانوروں کی طرح بیان نہیں کی گئیں۔ وہ آدمیوں کی مانند بھی نہیں تھے۔ سب کے سر بڑے تھے اور آنکھیں تھی ہی نہیں۔ ایسے ایسے واقعات بیان کیے جانے لگے جو نہ انھوں نے نہ ان کے پرکھوں نے سنے تھے۔ دس سال کی بچی ایک ایسے بچے کو جنم دے گی جو اگلے ہی لمحے اسی سال کا بوڑھا لگنے لگے گا؛ آدمی اور بڑے سر والے جانور ایک ہی کھولی میں لمبے لمبے کیڑے کھا رہے ہوں گے؛ درختوں پر پتوں کے بجائے انسانی ناخنوں جیسے کانٹے اگے ہوں گے؛ شہر کو پانی مہیا کرنے والی نہر میں پیپ جیسی کوئی شے بہہ رہی ہوگی۔ ایسے واقعات ان کے پرکھوں نے کہاں سنے تھے۔

یہ سب لکھتے لکھتے رفتہ رفتہ لوگوں کے دانت بڑے ہونے شروع ہوئے، پھر ان کے منھ سے باہر لٹکے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ اسی دوران میں بادشاہ نے منادی کرادی کہ کوئی شخص دوسرے کو قتل نہیں کرے گا۔ یہ ایک نئی سزا تھی۔ انھیں لگا قتل کرنا آسان ہے، مگر قتل نہ کرنے کا ہر وقت ارادہ باندھے رکھنا مشکل ہے۔ انھیں اپنے باہر لٹکے ہوئے دانتوں کے ساتھ قتل سے باز رہنا ایک اور کڑی سزا محسوس ہونے لگا۔ چناں چہ اس منادی کے بعد زیادہ قتل ہوئے۔ بالآخر نفرت کا ذخیرہ بھی ختم ہونے لگا۔ لوگوں پر تھکان طاری رہنے لگی۔ اکثر نے خودکشی کرلی۔

اسے شہر میں قیام کی اجازت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ اس دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ اس نے پہلے سوچا کہ وہ اندھوں اور گونگوں کے شہروں کا مختصر احوال لکھے گا۔ پھر کچھ سوچ کر اتنا لکھا: لکھنا بھی سزا ہے، پر کسی بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے۔

راکھ سے لکھی گئی کتاب

ہم تین آدمی ہیں۔تینوں کے ذمے الگ الگ کام ہیں۔کبیر کو وہ سب ورق الگ کرنے ہیں جو جلنے سے بچ گئے ہیں۔انصاری سے کہا گیا ہے کہ وہ راکھ الگ کرتا جائے۔مجھے اور ہی طرح کا کام سونپا گیا ہے۔ضرورت سے زیادہ تقدیر ہمیں یہاں لے آئی ہے۔

کتاب خانے میں آگ کیسے لگی؟ یہ سوال ہم تینوں کے ذہن میں ویسے تو ہر وقت آتا رہا ہے؛ جب ہم مل کر کھانا کھاتے،دوپہر کو تھوڑی دیر ستاتے اور رات کو کھانے کے ساتھ قہوہ پیتے ہوئے دنیا جہان کی باتیں کرتے۔لیکن اس وقت شدت سے ابھرتا جب ہم اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے۔ہمیں پہلے دن منع کر دیا گیا تھا کہ یہ سوال نہ تو ان لوگوں سے پوچھنا ہے جو ہمارے کھانے پینے اور آرام مہیا کرنے کے ذمہ دار ہیں،اور نہ آپس میں اس پر کبھی،کسی وقت زبان کھولنی ہے۔پر ہم تینوں کو معلوم ہے کہ یہ سوال کسی وقفے کے بغیر ہمارا پیچھا کرتا ہے اور اس وقت ہمیں دبوچ لیتا ہے جب ہم اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے ہیں۔لیکن رفتہ رفتہ ہم نے کچھ نئی باتیں دریافت کی ہیں۔شروع میں ہمیں الجھن ہوئی اور تلملائے بھی کہ آخر اس سوال پر بات کرنے سے کیوں منع کیا گیا ہے؟ کچھ دنوں بعد ہم اپنی حیثیت کو قبول کرنے لگے۔ہم یہاں نوکر ہوئے ہیں اور ہر نوکری کی شرائط ہوتی ہیں جنھیں مالک ہی طے کرتا ہے۔عارضی ملازمت میں مطالبے،احتجاج،شکایت کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔اسی نے یہ بھی طے کیا ہے کہ ہمیں زیادہ سے

زیادہ تین ماہ میں کام مکمل کرنا ہے۔ کبیر اور انصاری کے لیے یہ تین ماہ زیادہ ہیں، مگر میرے لیے کم ہیں۔ میرے کام کی نوعیت صرف وقت کی محتاج نہیں۔

جب تک ہم نے اپنی حیثیت کو تسلیم نہیں کیا تھا، یہ سوال ہمیں پریشان کرتا تھا کہ آخر ان کتابوں کو آگ کیوں لگائی گئی۔ اب جب کہ ہمیں ہر کھانے کے دوران میں اپنی حیثیت اور اوقات کا احساس دلایا جانے لگا ہے تو ہم اور طرح سے سوچنے لگے ہیں۔ ہمارا مالک، جس سے ہماری ملاقات ابھی تک نہیں ہوئی، شاید آخر میں کہیں ہو جائے، وہ اس بات کو سمجھتا ہوگا کہ کام کے دوران میں کسی سوال کا پیدا ہونا اچھا نہیں اور اگر وہ سوال اسی کام کے بارے میں ہو تو کام اور کام کرنے والے دونوں کے لیے مضر ہے۔ میرے پردادا کا واقعہ مجھے نہیں بھولتا۔ وہ ایک ہرن کا شکار کرنے کے لیے گھوڑا دوڑا رہے تھے تو ان کے ذہن میں اچانک سوال پیدا ہوا کہ ہرن اس قدر تیز کیسے دوڑ لیتا ہے؟ بس اس کے بعد وہ نہ کبھی گھوڑے پر سوار ہو سکے نہ ہرن کا پیچھا کر سکے۔

میرے لیے کتابوں کو آگ لگانے کا واقعہ کوئی نئی بات نہیں۔ جس شہر سے میں آیا ہوں وہاں تو اکثر کتابیں جلائی جاتی ہیں۔ میرے لیے تو اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ کچھ کتابوں کے جلانے سے فساد شروع ہوئے اور کچھ کے جلانے سے فساد ختم ہوئے۔ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے۔ میں کئی دنوں کی آوارہ گردی کے بعد اپنے شہر میں داخل ہوا تو ایک چوک میں لوگوں کا جم غفیر دیکھا۔ کوئی نعرے لگا رہا تھا، کچھ مکے لہرا رہے تھے۔ سب کے چہروں پر غصے اور اطمینان کی ملی جلی کیفیت تھی۔ درمیان میں ایک بڑا سا الاؤ روشن تھا۔ پہلے تو مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ قصہ کیا ہے۔ پھر پتا چلا کہ ایک فرقے کے گھروں میں موجود سب کتابیں نکال لائے ہیں اور انھیں جلایا جا رہا ہے۔ اسی دوران میں ایک نوجوان نے چیختے ہوئے کہا کہ اگر آئندہ ان کے گھروں سے کوئی کتاب ملی تو پہلے گھر کو آگ لگائی جائے گی پھر گھر والوں کو۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ ایک ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا۔ چیخا۔ جب تک لکھنے والے ہاتھ موجود ہیں، تب تک یہ لوگ

کتابیں لکھتے رہیں گے، ان کے ہاتھ توڑ دینے چاہییں۔ سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔ سب نے ادھر ادھر دیکھا۔ کچھ کی نظر مجھ پر پڑی۔ ایک نوجوان جو مجھے نہیں جانتا تھا، چیخا۔ یہ اسی فرقے کا ہے۔ توڑ دو اس کے ہاتھ۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ چار پانچ لوگوں نے مجھے پہچان لیا اور میں بچ گیا۔ لیکن ایک بزرگ نے ایک جلے ہوئے کاغذ کو اٹھایا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے لہرایا۔ میں سمجھ گیا۔ وہاں سے رخصت ہولیا۔ گھر پہنچا تو بڑے بیٹے نے کہا کہ ابا آج ایک بڑا فساد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ شکر ہے ان لوگوں نے اپنی سب کتابیں، جن میں ان کے بچوں کے بستوں میں موجود کتابیں بھی تھیں چپ چاپ ان کے حوالے کردیں۔ اس بات کو بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک شام ایک شخص اس گلی کے آخری سرے پر پہنچا جس کا خاتمہ ایک گھر کے دروازے پر ہوتا ہے، اس نے شور مچادیا کہ اسے ادھ جلا کاغذ ملا ہے۔ اس گلی میں ایک ہی خاندان کے افراد کے گھر ہیں جو پچھلی صدی کے شروع میں یہاں آ کر آباد ہوا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس آخری گھر کو آگ لگادی گئی جس کے سامنے اس نے وہ کاغذ اٹھانے کا دعویٰ کیا تھا۔ گھر کے افراد فوراً دوسرے گھروں میں چلے گئے اور ان کی جان بچ گئی۔ ایک ہفتے بعد ہی وہاں ایک پلازہ بننا شروع ہوگیا، جس دن اس کی بنیادیں کھودی جارہی تھیں، چاولوں کی بیس دیگیں پکائی گئیں اور اللہ کی راہ میں تقسیم کی گئیں۔ میں اور میرے بڑے بیٹے نے ان دونوں واقعات پر تحقیق کی جسے ہم نے شہر کے حاکم کو پیش کیا۔ اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ یہ نیک کام ہے مگر ایک بار ہی کافی ہے۔ اس کا بھلا ہو کہ اس نے کسی کو اس کی خبر نہیں ہونے دی۔ شاید یہ بات اس شخص کو معلوم ہے جس نے مجھے یہاں ملازمت کے لیے بلایا تھا۔ اگرچہ مجھے حیرت ہے کہ اتنی دور رہنے والے شخص تک میری خبر کیسے پہنچی؟

جب کوئی سوال پیچھا کرتا ہے تو اپنا جواب بھی وہ خود تلاش کرلیتا ہے۔ اس کتاب خانے کو آگ کیسے لگی، اس کا جواب ایک شام مجھے مل ہی گیا۔ لیکن میں نے اس کا ذکر کسی سے

نہیں کیا۔کوئی آگ اتفاقاً نہیں لگتی، کتابوں کو تو بالکل نہیں۔

کبیر مجھے روزانہ ادھ جلے اوراق صاف کر کے دے دیتا ہے۔ میں پہلے انھیں پڑھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ پڑھنے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی، مگر پہلی بار کچھ سمجھ نہیں آتا۔ مجھے وہ تینوں زبانیں آتی ہیں، جن میں اس کتاب خانے کی سب کتابیں لکھی گئی تھیں۔وہ تحریریں بے ربط نہیں ہیں، بے تسلسل ہیں۔ یہ کچھ ایسے ہی ہیں جیسے کسی مصروف جگہ پر بم دھماکہ ہو۔لوگوں کے جسموں کے زیادہ حصے جل کر راکھ ہو گئے ہوں۔بس کچھ اعضا جلنے سے بچ گئے ہوں۔ کسی کی آنکھ، کسی کی انگلی، کسی کا انگوٹھا، کسی کا آدھا بازو، کسی کی ران، کسی کی کھوپڑی کا کچھ حصہ، کسی کے صرف ناخن، کسی کے دانت، کسی کے ہونٹ، کسی کی زبان، کسی کا جنسی عضو، کسی کی ناک، کسی کی سرین باقیات میں سے ملے۔ یہ بھی کچھ آدھی جلی ہوئی ہوں، کچھ سلامت ہوں۔ کسی سے کہا جائے کہ ان سب کو اکٹھا کر کے ایک شخص کا جسم مکمل کیا جائے۔ کسی حصے کو نہ تو ضائع کیا جائے، نہ اس میں کوئی تبدیلی کی جائے۔جسم بھی ایک جیتے جاگتے انسان کا معلوم ہو۔ میں اس کام کو مشکل نہیں سمجھتا۔ میں کسی کام کو مشکل نہیں سمجھتا۔کسی کے لیے بھی کوئی کام مشکل نہیں۔ ہر آدمی کی کھوپڑی میں ایک مشین ہے، اسے جو کام سونپ دیں وہ اسے کر لیتی ہے۔اس سے زیادہ سفاک اور ایجاد پسند دنیا میں کچھ نہیں، اس کا مجھے یقین ہے۔ مجھ میں اور دوسروں میں اگر کوئی فرق ہے تو بس اس یقین کا ہے۔ کتابوں کے جلے ہوئے اوراق اور بم دھماکے میں مرنے والوں کے جسموں میں کچھ فرق ہوگا، مگر میں اس پر توجہ نہیں دیتا۔ میرے لیے ایسا سمجھنا ضروری بھی ہے۔ مجھے ان ادھ جلے، بچے کچھے اوراق سے ایک ایسی کتاب تیار کرنا ہے جو واقعی کتاب ہو۔ مجھے اس میں نہ تو کچھ اضافہ کرنا ہے، نہ کمی۔ میں ہر رات یہ بات دہراتا ہوں کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔

جب ایک ماہ گزرا تو ان کاغذوں کا خاصا بڑا ڈھیر جمع ہو گیا۔اب میں نے انھیں پڑھنے کے ساتھ ساتھ، انھیں ترتیب دینے کا کام بھی شروع کر دیا۔ان بے تسلسل تحریروں سے مجھے اتنا

تو اندازہ ہو گیا ہے کہ انھیں ایک خاص ذوق کے آدمی نے جمع کیا تھا۔ اسے قصوں، تاریخ، سفر ناموں اور مذہبی کتابوں سے خاص دل چسپی تھی۔ کچھ کتابیں ہاتھ سے لکھی ہوئی تھیں، باقی چھپی ہوئی تھیں۔ پرانی تو خیر سب کی سب تھیں۔ پرانی کتابوں کو جلا ہوا دیکھنے کے لیے وہی جگر چاہیے جو کٹے ہوئے جسموں کو دیکھنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔ ایک بار تو جی چاہا کہ یہاں سے نکلوں، شہر کے چوک میں جاؤں اور سینہ کوبی کروں۔ کوئی پوچھے تو اور زور سے اپنا سینہ پیٹوں۔ ایک مرتبہ پھر مجھے وہ منظر یاد آنے لگا جب میں نے اپنے شہر میں جلے ہوئے، ٹنڈ منڈ انسانی اعضا جابجا بکھرے دیکھے تھے۔ جس دن سینہ کوبی کے لیے میرا جی بے اختیار ہوا تھا، اسی رات میں نے خواب میں عجب منظر دیکھا۔ میرے جسم پر کپڑوں کی جگہ ان کتابوں کے جلے ہوئے ٹکڑے چپکے ہیں اور میں اپنے شہر میں اسی جگہ کھڑا ہوں جہاں میں نے جلے ہوئے، ٹنڈ منڈ انسانی اعضا دیکھے تھے۔

اگلی صبح میں نے ہر موضوع سے متعلق کاغذوں کے ٹکڑے یکجا کرنے شروع کیے۔ جب دوسرا مہینہ گزرا تو تقریباً سب ادھ جلے، معمولی جلے، معمولی بچے ہوئے سب کاغذ ترتیب سے میں نے رکھ لیے۔ کبیر اور انصاری کا کام تو ختم ہو گیا۔ پہلے مجھے خیال آیا تھا کہ ہر زبان کے کاغذ الگ الگ رکھوں، پھر میں نے سوچا جب ایک ہی کتاب تیار کرنی ہے تو انھیں الگ الگ رکھنے کا مطلب۔ یہ کچھ ایسا ہی تھا کہ ایک انسانی جسم کو مکمل کرنے کے لیے آدمی کو عورتوں، بچوں، بوڑھوں، مردوں کے اعضا سے کام لینا پڑے۔

آخری مہینے کے پہلے چند دنوں میں مَیں نے سب کاغذات کو دوبارہ پڑھا۔ جب پہلی بار انھیں پڑھا تھا تو کچھ زیادہ پلے نہیں پڑا تھا۔ دوسری بار ہر کاغذ کو اس طرح پڑھا جیسے لکھنے والے کا مخاطب میں ہی تھا۔ کچھ کاغذوں کو صرف ایک بار پڑھنا پڑا۔ زیادہ تر کو دو دو تین تین مرتبہ۔ جنھیں ایک مرتبہ پڑھنا پڑا، ان میں روزمرہ کی کوئی بات لکھی ہوئی تھی۔ وہ فوراً سمجھ آ جاتی مگر

عجیب بات یہ ہوئی کہ کچھ دیر بعد ذہن سے اتر جاتی۔ جن کا غذات کو زیادہ مرتبہ پڑھنا پڑا ان میں وہ باتیں تھیں جن کے بارے میں مَیں نے پہلے سنا تھا نہ ان پر کبھی سوچا تھا۔ وہ دیر سے سمجھ آتیں مگر دیر تک یاد بھی رہتیں۔ کچھ میں خواب جیسی کہانیاں تھیں۔ انھیں سمجھنا آسان نہیں تھا، پر وہ دل چسپ تھیں۔

میں نے دو دن کوئی کام بھی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ بس صبح اٹھتا۔ ان دونوں کے ساتھ ناشتا کرتا۔ سیر کے لیے نکل جاتا۔ دوپہر کو واپس آتا۔ کھانا کھاتا۔ سو جاتا۔ سہ پہر کو پھر سیر کے لیے نکل پڑتا۔ رات کو کھانا کھاتا۔ کچھ دیر چہل قدمی کرتا اور پھر بستر پر لیٹ جاتا۔ کسی سے کوئی بات نہ کرتا۔ یہ راز مجھ پر ایک سفر کے دوران کھلا تھا کہ اگر کسی سخت ترین آزمائش سے کامیاب گزرنا ہے تو خود کو پورے کا پورا اس آزمائش کے سپرد کر دو۔ کسی سے اس کے بارے میں ایک لفظ نہ کہو۔ میں ایک آوارہ گرد ہوں۔ ایک ہفتے سے زیادہ کبھی گھر نہیں ٹھہرا۔ البتہ نئی جگہوں پر زیادہ وقت ٹھہرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔ سردیوں کا موسم تھا۔ میں نے ایک پرانے قلعے کو دیکھنے اور اس سے زیادہ اسے جاننے کی ٹھانی۔ وہ میرے شہر سے کوئی سو میل کے فاصلے پر تھا۔ کسی زمانے میں وہاں آبادی رہی ہوگی، مگر اب وہاں قلعے کے آثار کے سوا کچھ نہیں تھا۔ البتہ اس سے دو میل کے فاصلے پر چھوٹی سی آبادی تھی، جہاں ٹھہرا بھی جا سکتا تھا۔ میں رات کو وہاں ٹھہرتا۔ دن کو قلعے کی طرف چلا جاتا۔ مجھے قلعے کی کچھ کچھ تاریخ معلوم تھی کہ اسے کوئی آٹھ سو سال پہلے ایک افغان حملہ آور نے تعمیر کروایا تھا۔ وہ علاقہ زرخیز زرعی علاقہ تھا۔ جن کسانوں کو اس نے زیر کیا تھا انھی کو مزدور بنا کر وہ قلعہ بنوایا تھا، اور انھی کے ڈر سے پھر اس قلعے میں وقت گزارتا تھا۔ اس سے زیادہ میں قلعے کی تاریخ میں کتابوں میں سے نہیں پڑھنا چاہتا تھا۔ میں اس قلعے ہی سے اس کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ یہ نہیں کہ میں پرانے مؤرخوں کو محض جھوٹا سمجھتا ہوں، جھوٹے تو خیر وہ ہوتے ہیں، اس لیے تو ان کا لکھا قابل اعتبار لگتا ہے، وہ اس چیز کے جاننے میں حائل ہو جاتے

ہیں۔آدمی اس چیز میں دل چسپی کھودیتا ہے اور مئورخ کی باتوں میں کھو جاتا ہے۔یہ سب کتابوں کے ساتھ مصیبت ہے،جن کے بارے میں ہوتی ہیں،انھی سے آدمی کو دور کر دیتی ہیں۔خیر میں قلعے میں گھوما پھرا۔وہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا۔جیسے یہ اوراق آدھے یا کم جلے ہوئے ہیں۔مجھے تو ٹوٹے قلعے ہی اچھے لگتے ہیں۔وہ کافی بڑا تھا۔کوئی دومیل میں پھیلا ہوا تھا۔اسی قلعے میں ایک محل تھا۔اس میں گیا۔اس کی چھت آدھی گری ہوئی تھی۔مجھے اس بات میں زیادہ دل چسپی نہیں تھی کہ وہ قلعہ کس پتھر سے بنا،پتھر کہاں سے آیا۔کیسے آیا۔کون سا مسالہ استعمال ہوا۔سیمنٹ کی جگہ چونا،دال،انڈے کتنے استعمال ہوئے۔کتنے لوگوں کو انگلیاں گل کٹ گئیں،جب اس افغان کا معمار مسالہ تیار کر لیتا تو اس کی پختگی کا اندازہ لگانے کے لیے اس میں کسی غلام کو ہاتھ ڈالنے کا کہتا۔انگلی گل جاتی تو مسالہ ٹھیک سمجھا جاتا،ورنہ دوبارہ تیار ہوتا۔نہ مجھے اس بات میں کوئی کشش محسوس ہوئی کہ جب کچھ مزدوروں نے ایک دن پتھر ڈھونے سے انکار کیا تو ان کی لاشوں کو اس مسالے میں شامل کر کے قلعے کی جنوبی دیوار کا حصہ بنا دیا گیا۔مجھے اس بات میں دل چسپی تھی کہ وہ بادشاہ اپنے محل میں اپنی خلوت میں کیا کرتا تھا۔یہ میں اس محل میں کھڑا ہو کر جاننا چاہتا تھا۔ایک شخص میرے پاس آیا،جو کسی دوسرے ملک سے آیا تھا۔کہنے لگا،تم یہ اتنی دیر سے کیا دیکھنے کی کوشش کر رہے ہو؟ میں نے بتا دیا۔وہ ہنسا۔کافی دیر تک۔پوچھا: یہ کیوں جاننا چاہتے ہو؟ میں نے کہا،اس لیے کہ اس کے بغیر میں ایک بادشاہ کو آدمی خیال کرنے سے قاصر ہوں۔ اب وہ سنجیدہ ہوا۔اس نے ایک زبردست بات کہی۔خلوت میں بادشاہ تو ہوتا ہی نہیں۔میں نے کہا تبھی تو وہ آدمی ہوتا ہے۔خیر وہ چلا گیا۔اب میں ایک محل کے آثار کے پاس ہوں،مگر یہ سمجھنے کا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا کہ وہ خلوت میں کیسا تھا؟ میں روزانہ وہاں آنے لگا۔اب میں نے کسی سے کوئی بات نہ کرنے کا تہیہ کیا۔مجھے خود محل یہ سب راز بتائے گا۔میں ایک بڑی آزمائش میں تھا۔کوئی ایک ہفتے بعد میں اس محل کی ایک دیوار کے ساتھ لگا بیٹھا تھا۔تینوں طرف غور سے دیکھ رہا

تھا۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ صرف سامنے کی دیوار پر ذرا سی دھوپ آ رہی تھی۔ ٹھنڈ محسوس ہو رہی تھی۔ شام کو سب لوگ چلے جاتے ہیں۔ اب میں وہاں اکیلا تھا۔ رات ہو چکی تھی۔ میں وہیں بیٹھا تھا۔ پہلے ایک عورت آئی۔ پھر دوسری۔ پھر تیسری اور پھر چار عورتیں اکٹھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ تم یہاں روز آتے ہو۔ جی۔ اس کے بعد ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ پہلی عورت آگے بڑھی۔ میرے پہلو میں لگ کے بیٹھ گئی۔ دوسری آگے آئی۔ دوسرے پہلو میں لگ کے بیٹھ گئی۔ تیسری سامنے بیٹھ گئی۔ باقی چاروں میرے گرد کھڑی ہو گئیں۔ میں نے خود کو پورے کا پورا انھیں سپرد کر دیا، کسی طلسم کے تحت۔ میں جب محل سے باہر آنے لگا تو انھوں نے کہا۔ تم چاہو تو کبھی کبھی اس بستی میں آ سکتے ہو۔

مجھے پوری رات اس واقعے کا یقین نہیں آیا (اب بھی نہیں آتا) مگر میرا جسم سب سے بڑا گواہ تھا۔ جسم سے بڑا گواہ کون ہو سکتا ہے؟ البتہ اس بات میں مجھے شک نہیں ہوا کہ میں بادشاہ کی خلوت کا راز جان گیا تھا۔ اس راز کا میرے موجودہ کام سے گہرا تعلق ہے۔

مجھے تیسرے دن معلوم ہو گیا کہ مجھے کام کیسے شروع کرنا ہے۔ مجھے باقی دن اسی کمرے میں بیٹھنا ہے۔ کسی آدمی سے کچھ سننا ہے نہ کہنا ہے۔ پہلے میں نے فیصلہ کیا کہ ان آوازوں کو تو بالکل نہیں سننا ہے جو تنہائی میں یا رات کو اچانک آنکھ کھلنے پر سنائی دیتی ہیں۔ کوئی تین دن تک میں نے کسی سے کوئی بات کی نہ سنی۔ میں مطمئن ہوا کہ اس طرح میں جلد اپنا کام مکمل کر لوں گا۔ لیکن جلد ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ یہ اطمینان عارضی تھا اور کچھ دنوں سے تو لگ رہا ہے کہ جسے اطمینان کہتے ہیں وہ ہوتا ہی وقتی ہے۔ اس لیے مجھے اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی کرنا پڑی۔ مجھے یاد آیا۔ آوارہ گرد طبیعت مجھے ایک بار ایک ایسا غار دکھانے لے گئی، جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں ان لوگوں کی آوازیں اب تک سنائی دیتی ہیں جو صدیوں پہلے وہاں رہے

تھے اور غار کی دیواروں پر تصویروں کی صورت اپنی یادگار چھوڑ گئے تھے۔ روایت یہ بھی تھی کہ وہ تصویریں بولتی ہیں۔ میں سہ پہر کے وقت وہاں پہنچا تھا۔ بہار کا موسم تھا۔ مجھے کوئی پانچ کوس چلنا پڑا تھا۔ غار کے آس پاس ہرے بھرے درخت، جھاڑیاں اور بے شمار، رنگ رنگ کے پھول تھے۔ انھیں دیکھ کر تھکاوٹ جاتی رہی تھی۔ غار کے دہانے کے پاس کچھ جنگلی پھل پڑے تھے۔ شاید کچھ دیر پہلے وہاں کوئی آیا تھا۔ میں غار کے اندر داخل ہوا۔ خاصی خنکی تھی اور خاموشی۔ غار کے بائیں جانب سے ایک سوراخ سے دھوپ کی لکیر پڑ رہی تھی جس سے غار کا کافی حصہ روشن تھا۔ دونوں دیواروں پر غور سے دیکھنے سے کچھ تصویروں کے سلیٹی رنگ کے نقوش ابھرتے نظر آتے۔ فوری طور پر سمجھنا مشکل تھا کہ وہ تصویریں کس قسم کی ہیں۔ جب ایک طرف کی پوری دیوار دیکھ لی تو معلوم ہوا کہ اصل میں ایک ہی بڑی تصویر ہے، میورال قسم کی۔ ایک ہی آدمی کا جنم، بچپن، جوانی، بڑھاپا، موت اور موت کے بعد پھر زندہ ہوتے دکھایا گیا تھا۔ ہر جگہ اس کے چہرے کے نقوش اور تاثرات مختلف تھے۔ دوسری دیوار پر بھی میورال تھا، جو پہلے میورال کی بھدی نقل تھا۔ غار کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک وقت میں کوئی پچاس کے قریب لوگ وہاں سما سکتے تھے۔ جتنی دیر میں مَیں نصف کاغذ پر لکھی گئی تحریر کا مطالعہ کرتا ہوں، اتنا ہی وقت مجھے غار کے دوسرے سرے پر پہنچنے میں لگا تھا، جہاں کچھ طاقچے بنائے گئے تھے، اور جہاں پتھر کے کچھ ٹوٹے برتن پڑے تھے۔ جب تک غار میں دھوپ رہی، میں ان تصویروں کو بار بار چل کر دیکھتا رہا۔ جب اندھیرا ہوا تو درمیان میں بیٹھ گیا۔ غار کے دہانے پر بس اتنا اجالا تھا کہ دہانہ نظر آتا تھا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ پچھلے تین پہر سے میں نے کسی سے کوئی بات نہیں کی، نہ کوئی بات سنی۔ ایک دم مجھ پر گہری خاموشی اور اداسی کا غلبہ ہوا۔ کچھ کچھ خوف بھی محسوس ہوا۔ میں نے اپنی زبان اوپر کے دانتوں پر باہر کی طرف سے اور نیچے کے دانتوں پر اندر کی طرف پھیری۔ دونوں کانوں میں دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں ڈال کر تیزی سے گھمائیں۔ سر کو جھٹکا دیا اور پاؤں پٹخے۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ مجھے کچھ آوازیں سنائی دیں، سرگوشی جیسی۔ میں نے پہلے تو ہمت جمع کی، پھر انھیں سمجھنے کی کوشش کی۔ یہیں سے گڑبڑ ہوئی۔ میں کانپنے لگا اور آوازیں جیسے میرے خون میں تیرنے لگیں اور ایک ایسا غل مچانے لگیں جس کا مجھے پہلے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ میں نے غار کی دیوار کا سہارا لیا اور آنکھیں بند کیں۔ دائیں طرف کی دیوار کا میورال پوری طرح روشن ہو گیا تھا۔ ایک ہی لمحے میں کوئی کوکھ سے نکلا، رویا، غوں غاں کی، چار پاؤں، دو پاؤں پر چلا، بھاگا، جوان، بوڑھا ہوا اور مر گیا، اور ایک طویل گہری خاموشی۔ اس لمحے (جس کی طوالت کے بارے میں مَیں اب بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتا) میں یہ فرق مٹ گیا تھا کہ میں ان واقعات کو دیکھ رہا تھا یا یہ سب مجھے پیش آ رہے تھے۔ میں نے کئی باتیں سنیں اور ہر بات مجھے واضح سنائی دی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو ایک لمحے کو لگا کوئی میرے سر پر ہاتھ رکھ رہا ہے، ایک مہربان لمس تھا، مگر وہ مجھے نظر نہیں آیا۔ اس لمس کو میں اس وقت بھی محسوس کر سکتا ہوں۔ جیسے ہی میں غار سے باہر آیا۔ کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا: دنیا غار نہیں ہے، غار دنیا نہیں ہے، غار دنیا میں نہیں ہے، آدمی غار سے نہیں نکلا، غار آدمی سے نہیں نکلا، کوئی غار میں ہے نہ غار میں کچھ ہے۔ جو کچھ ہے، وہ کچھ نہیں ہے۔ ابھی چند قدم ہی چلا تھا کہ معلوم ہوا میں خود ہی بڑبڑا رہا تھا اور بے خبر تھا۔ میری آواز کو کیا ہو گیا؟ کیا یہ میری ہی آواز ہے؟ یہ ایک ایسی آواز تھی جسے میں نے آج تک نہیں سنا تھا۔ یہ سب حیرت انگیز تھا ہی، میری آوارہ گرد طبیعت کے لیے خطرناک بھی تھا۔ میں نے پوری طاقت سے اپنا نام پکارا۔ یہ میری آواز تھی جو فوراً ہی پلٹ کر آئی۔ میں نے ایک وہی جنگلی پھل توڑا جسے میں غار کے دہانے پر دیکھا تھا اور جس کا نام مجھے معلوم نہیں۔ بس نشانی کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ میں اپنی سب چیزیں ایک الماری میں رکھتا ہوں۔ وہ پھل اب بھی وہاں پڑا ہوگا۔

آدھی رات گزری ہوگی، جب ایک نئی بات ہوئی۔ میرے تعجب کی انتہا کا لمحہ وہ تھا جب ان ادھ جلے کاغذوں سے وہی آوازیں سنائی دینے لگیں جو مجھے رات کی تنہائی میں سنائی

دیتی تھیں۔ ابھی مجھے ایک ہفتہ گزرا تھا کہ ایک رات میں دیر تک ان کاغذات کا مطالعہ کرنے کے بعد ستانے کے لیے لیٹا۔ چراغ بجھا دیا اور آنکھیں بند کی ہی تھیں کہ مجھے لگا کوئی شخص میرے کان میں سرگوشی کر رہا ہے۔ کبیر اور انصاری دوسرے کمرے میں رہ رہے تھے اور ان سے میری ملاقات ایک ہفتہ پہلے ہوئی تھی۔ سرگوشی میں کوئی مجھ سے کہہ رہا تھا آدمی نے آئنہ اس لیے ایجاد کیا کہ وہ دیکھے کہ دوسرے اسے کیسے دیکھتے ہیں۔ آنکھیں بند کیے مجھے یاد آیا میں نے یہاں آکر ایک بار بھی آئنہ نہیں دیکھا اور کل شام کو مجھے خیال آیا تھا کہ معلوم نہیں اب میرا چہرہ کیسا لگتا ہے؟ حجام آتا رہا ہے اور مجھے موڑھے پر بٹھا کر میرے سر اور ڈاڑھی کے بال تراشتا رہا ہے۔ آئنے سے فوراً مجھے یاد آیا کہ آج ہی میں نے ایک کاغذ پر پڑھا تھا کہ ''آئنے میں بوڑھے بادشاہ کو اپنی مونچھیں ٹھیک کرتے ہوئے دیکھ کر دونوں لونڈیاں ہنس پڑیں۔ بادشاہ نے ان کی آنکھوں سے چھلکتے طنز کو پڑھ لیا۔ طبیب کو طلب کیا۔ طبیب نے کہا: دوا دے رہا ہوں مگر احتیاط ضروری ہے۔ بوڑھے بادشاہ کو طبیب کی ہدایت سے زیادہ جوان لونڈیوں کی مسکراتی آنکھوں کا طنز زیادہ یاد رہتا۔ چند ہی دنوں بعد اس کا مثانہ جواب دے گیا۔ طبیب نے افسوس کے ساتھ یاد دلایا کہ اس نے احتیاط سے کام لینے کو کہا تھا۔ ایک ہفتے بعد پورے عالم پر حکومت کا خواب دیکھنے والے بیٹے کو بادشاہ کی موت کی اطلاع ملی تو اسے یقین نہیں آیا۔ مگر وہ یقین کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے اعتبار کا آدمی قلعے کو روانہ کیا۔ جاؤ اور سرخ گرم سلاخ اس کے پاؤں سے گزارو۔ پھر سر سے حلق کی طرف۔ اس سے کم دلیل اسے بادشاہ کی موت کا یقین نہیں دلا سکتی تھی''۔ اس سے آگے کاغذ جلا ہوا تھا۔ مگر عجیب بات ہے کہ مجھے لگا کاغذ کا وہ حصہ جو جل گیا تھا، وہ صحیح سلامت میرے سامنے ہے اور میں اسے پڑھ رہا ہوں۔ ''اسے جیسے ہی بوڑھے بادشاہ کی موت کا یقین ہو گیا، وہ خاص خاص درباریوں کے ساتھ قلعے کی طرف روانہ ہوا۔ اس کی ہدایت پر میت کے سر اور پاؤں کے زخموں کو پھولوں سے چھپا دیا گیا۔ جب میت پہلے سے تیار قبر کے پاس لائی گئی تو اس نے

میت کا چہرہ دیکھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: کل من علیھا فان ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام۔ وہ بار بار اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا تھا۔ اپنی ڈاڑھی سے آنسو صاف کرتا تھا۔ سب سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔ خاصی دیر گزر گئی تو جھکا، میت کے چہرے کے قریب ہوا۔ سب چار قدم پیچھے ہٹ گئے۔ صرف ایک محافظ اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اس نے سنا۔ خدا تمھیں بخش دے۔ تم جب تک زندہ تھے، میں عذاب میں تھا۔''

مجھے اطمینان ہوا کہ اب ان کاغذات کو ترتیب دینا مشکل نہیں رہا تھا!

اب تک میں جان چکا ہوں کہ یہ سب ادھ جلے کاغذات بے تسلسل ضرور ہیں، بے ربط نہیں ہیں۔ یہ راز مجھ پر ان دو مہینوں اور دو ہفتوں میں کھل گیا ہے کہ دنیا کی ہر کتاب دوسری سب کتابوں سے کوئی نہ کوئی تعلق رکھتی ہے اور دنیا کی ہر کتاب کا تعلق دنیا میں موجود ایک شخص سے ضرور ہے۔ میں اس جھنجھٹ میں نہیں پڑوں گا کہ وہ تعلق کیسا ہے، سیدھا سادہ یا ٹیڑھا میڑھا۔ بس یہ کافی ہے کہ تعلق ہے۔ مجھے صرف ان کاغذات میں تسلسل قائم کرنا ہے، اور اس کا ایک طریقہ تو میں ڈھونڈ چکا اور آزما چکا ہوں۔

میں یقین کر چکا تھا کہ ان کتابوں کو لکھا تو الگ الگ لوگوں نے ہے، الگ الگ زمانوں میں اور الگ الگ زبانوں میں، مگر لکھا ایک ہی شخص کے لیے ہے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر تو لگی کہ وہ شخص کون ہے، مگر سمجھ گیا۔ وہ کم از کم میں نہیں ہوں۔ میں تو بھئی اسی دنیا کا ہوں۔ اس یقین کے بغیر میں ایک قدم نہیں اٹھا سکتا۔ میرے لیے یہ بات چونکانے والی تھی۔ اب تک میں انھیں اس یقین سے پڑھ رہا تھا کہ جیسے یہ سب میرے لیے لکھا گیا تھا، مگر جب سب کاغذات میں لکھی گئی باتوں پر مجموعی نظر ڈالی تو نئی بات معلوم ہوئی۔ کچھ دیر کے لیے تو میرا سر چکرا گیا۔ اتنی ساری، اتنے سارے زمانوں اور اتنے سارے لوگوں کی باتوں کو ایک ساتھ یاد کرنے سے سر کے

پھٹنے کا خطرہ بھی ہوسکتا ہے۔ آخر ایک کھوپڑی کتنا کچھ سہار سکتی ہے؟ خیر سر تو نہیں پھٹا مگر اس بے بس کر دینے والی حیرت سے سر ضرور چکرا گیا کہ جس یقین کے ساتھ میں نے یہ سب پڑھا تھا اور سمجھا تھا، وہ یقین باقی نہیں رہا تھا۔ میں اس صدمے کو بھی برداشت کر لیتا، اصل مصیبت دوسری تھی۔ یقین کے ٹوٹنے سے وہ سب جو میں نے سمجھا تھا، اس پر بھی حرف آ رہا تھا۔ میں نے تو یہ سمجھا کہ یہ سب اس دنیا کے مجھ جیسے شخص کے لیے لکھا گیا ہے۔ ہر کاغذ یہی بتا رہا تھا لیکن سب کاغذ مل کر دوسری کہانی سنا رہے تھے۔ اب کیا کیا جائے؟ میں نے کاغذات کے اس ڈھیر کے آگے بیٹھے بیٹھے سوچا۔

میں اپنے بارے میں صرف دو باتیں جانتا ہوں اور انھیں کافی سمجھتا ہوں۔ دونوں بتا چکا ہوں۔ آوارہ گرد اس لیے ہوں کہ جس دنیا کا ہوں، اسے جی بھر کے، اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ یہ ملازمت بھی اسی لیے قبول کی کہ مزید دنیا دیکھ سکوں۔ جس شخص نے مجھے ملازمت پر رکھا اسے میری یہ بات بہت پسند آئی تھی کہ جو شخص دنیا کو چل پھر کر دیکھتا ہے اور اپنی نظر سے دیکھتا ہے، وہی راکھ سے نئی کتاب ترتیب دے سکتا ہے۔ حالاں کہ وہ مجھے ملازمت پہلے ہی دے چکا تھا۔ اب مجھ پر کھلا ہے کہ یہ اس دنیا کے ایک آوارہ گرد کے لیے لکھی گئی کتابیں نہیں تھیں۔ یہ ایک ایسے شخص کے لیے لکھی گئی کتابیں ہیں، جو چلتا اسی زمین پر ہے، مگر سوچتا اس زمین کو نہیں ہے۔ اس کے پاؤں میں اسی زمین کا کوئی کانٹا چبھتا ہے تو وہ اِدھر اُدھر، اوپر دیکھنے لگتا ہے۔ اس سے وہ ابتلا میں رہتا ہے۔ یہ سب کتابیں اس کی ابتلا کو دور کرنے کی خاطر لکھی گئی ہیں۔ اسے یقین ہے کہ جو شخص کتاب لکھ لیتا ہے، اس کا تعلق اس دنیا سے ہوتا ہے جہاں کانٹے نہیں ہیں، جہاں ابتلا نہیں ہے۔ یہ بات گڑبڑا دینے والی تھی اور اس تعلق کو گڑبڑاتی تھی جو کتاب لکھنے والے اور کتاب پڑھنے والی کی دنیاؤں میں مَیں فرض کر رہا تھا۔ میں نے ایک پل کے لیے سوچا کہ میں بھی اپنی آوارہ گردی کی کہانی لکھوں گا، مگر اب سوچتا ہوں کہ اس سے بڑی حماقت کوئی اور

نہیں ہوگی۔ میں نے اس دنیا کا بس کچھ حصہ دیکھا ہے، میں اسے مناسب نہیں سمجھتا کہ باقی ان دیکھی دنیا کو دیکھنا چھوڑ کر کسی دوسری دنیا کا خیال کروں۔ یہ دوسری بات ہے کہ پچھلے دو ماہ اور پندرہ دنوں سے اپنی اصل دنیا سے کٹا ہوا ہوں۔ دوسری دنیا کا خیال بھی کیا شے ہے! نہیں اصل بات یہ ہے کہ خیال ہی دوسری دنیا ہے اور دوسری دنیا خیال ہی ہے۔ ان کتابوں سے تو بس یہی ظاہر ہے۔ ایک نصف جلے ٹکڑے پر کہانی کا کچھ حصہ میں آپ کو سناتا ہوں کہ کہیں آپ میری بات کو خیالی نہ سمجھیں۔ ''شہر میں ایک ہی بوڑھا شخص بچ گیا۔ باقی سب جنگ میں مارے گئے۔ اس نے اتنی لاشیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ لاشوں کو اس قدر کٹا پھٹا، بے آسرا پڑا ہوا بھی اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پہلے تو وہ رویا۔ اس سے اسے یقین آ گیا کہ وہ واقعی زندہ ہے تو زور زور سے ہنسنے لگا۔ اتنا ہنسا کہ اس کے آنسو نکلنے لگے اور اتنے آنسو نکلے کہ وہ ہنسنا بھول گیا''۔ اب آپ مجھ سے دو باتیں تو بالکل نہ پوچھیے۔ ایک یہ کہ دوسری دنیا یا خیال میں موت، تشدد ہی کیوں؟ دوسری بات یہ کہ اس چھوٹی کہانی میں کتنا حصہ جلی ہوئی کتابوں سے اور کتنا حصہ اس آواز کا ہے جو مجھے راتوں کی تنہائی میں سنائی دیتی ہیں، اور ان دنوں تو کثرت سے سنائی دیتی ہیں۔

میں نے اگلے پندرہ دنوں میں تمام کاغذات کو ترتیب دیا۔ ترتیب دینا آسان نہیں تھا، پر دو باتوں نے اسے قدرے آسان بنا دیا۔ میں جان چکا تھا کہ ہر کتاب کا تعلق دوسری کتاب سے ہے۔ یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ اس جھنجھٹ میں پڑنا بے کار ہے کہ تعلق کس قسم کا ہے۔ یہی نسخہ میں نے ترتیب کے ضمن میں بھی اختیار کیا۔ دوسرا جب ترتیب دے چکا تو پوری کتاب کو اس شخص کو سامنے بٹھا کر پڑھا۔ رات کو اسے کتاب سناتا۔ کمرے میں بس اتنی روشنی کا اہتمام کیا کہ صرف کتاب کے اوراق روشن رہیں۔ پہلی دو راتیں ترتیب سے کتاب سنائی۔ پھر بے ترتیبی سے۔ اس نے یکساں دل چسپی سے سنی۔ بس دو واقعات خاص ہوئے۔ ایک رات کتاب کے کچھ اوراق جل گئے۔ میرے لیے یہ معما ہے کہ دیے پر میرا ہاتھ لگا تھا یا اس شخص نے دیے کو

کتاب پر الٹا دیا تھا۔ دوسرا واقعہ زیادہ خاص اور چونکا دینے والا تھا۔ جس شخص نے مجھے ملازمت دی تھی، آخری رات وہ اس شخص کی جگہ بیٹھا کتاب سن رہا تھا اور اس کے چہرے پر اطمینان تھا، وہی اطمینان جس کی بابت میں پہلے آپ کو بتا چکا ہوں۔

تیسرے مہینے کا آخری دن آن پہنچا۔ سب نے دیکھا کہ جلے ہوئے کاغذوں کا ڈھیر ایک جگہ پڑا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی ڈھیری پڑی تھی۔ جلنے سے بچ رہنے والے کاغذات پر مشتمل تھی، مگر اس کے دائیں بائیں اور حاشیے پر نئی عبارتیں رقم تھیں۔ اس ڈھیری کو بعد میں جب پڑھا گیا تو وہ ایک مکمل کتاب تھی۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ کمرے کے کونے میں ایک جگہ راکھ کا ڈھیر تھا۔ کبیر اور انصاری دونوں نے حلفاً کہا کہ انھوں نے کتب خانے کے جلنے سے پیدا ہونے والی راکھ دوسرے کمرے میں سمیٹی ہے۔ انھوں نے یہ بھی حلفاً کہا کہ یہ راکھ جلے ہوئے کاغذوں کی نہیں ہے۔

''نکاح ٹوٹ سکتا ہے، قسم نہیں''

میں دو ہفتوں بعد گھر آیا تھا۔ عصر کا وقت ہوگا۔ السلام علیکم۔ ابا نے بے دلی سے وعلیکم السلام کہا۔ اماں نے بس ایک نظر مجھے دیکھا۔ وہ نظر اجنبی تھی۔ تھوڑی دیر میں کھڑا رہا تو اٹھیں۔ میرا ماتھا چوما۔ ان کے ہاتھ لرز رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نمی تھی۔ ثریا بے چین نظر آئی۔ میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کسی نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں نے خود کو ایک انجانی ہیبت اور سمجھ میں نہ آنے والی اداسی میں گھرا پایا۔

کیا ہوا؟ میری آواز کپکپا رہی تھی۔

کوئی نہیں بولا۔

ثریا میرے لیے پانی کا گلاس لائی۔ میں نے لے کر چارپائی پر ہی رکھ دیا۔ پانی گرتے گرتے بچا۔

بتاؤ ہوا کیا ہے؟ مجھ پر اچانک ایک نیا احساس غالب ہوا۔ مجھے لگا جیسے مجھ سے سب نے اچانک لاتعلقی اختیار کر لی ہو۔

ثریا نے امی ابا کی طرف دیکھا، جیسے اجازت چاہ رہی ہو۔ میں اٹھ کر امی کے پاس گیا جو دوسری چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ انھوں نے ابا کی طرف دیکھا۔

ابا خدا کے لیے بتایئے کیا ہوا۔ میں آخر اس گھر....؟ میں نے لاتعلقی کے احساس سے

بے بس ہو کر منت کی۔

انھوں نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔ ٹھنڈی آہ بھری۔ ایک پل کے لیے آنکھیں بند کیں۔ ایک ثانیے سے کم وقفے کے لیے ان کی پلکیں شدت سے لرزیں اور پھر کھلیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جلدی جلدی اسے پڑھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں بس اتنا کہہ سکا۔

اب میں چپ تھا اور وہ تینوں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اب میں سمجھا کہ میں نے کس احساس کے تحت خود کو ان سب سے لاتعلق محسوس کیا تھا۔

کیا یہ سچ ہے؟ میں نے خاموشی توڑی۔ اماں آپ بتائیے۔ آپ ہی بتا سکتی ہیں۔

انھوں نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

ابا آپ بتائیے کیا یہ سچ ہے؟ میں نے اپنے لہجے میں اب غصہ محسوس کیا۔

ابا نے چھوٹی بہن سے کہا کہ وہ کمرے میں چلی جائے۔

میں نے دوبارہ وہ تحریر پڑھی۔

اتنا سچ ہے کہ تمھاری ماں کا نکاح اس سے ہوا تھا، مگر وہ سات سال تک غائب رہا۔ سب نے کہا کہ وہ جنگ میں مارا گیا ہے۔ سب نے یقین بھی کیا۔ اس کے بعد تمھارے نانا نے امیراں کی شادی مجھ سے کر دی۔ اب وہ کہتا ہے کہ....

کیا وہ خود آیا تھا؟ میں نے ابا کو پوری بات نہیں کرنے دی۔

نہیں۔ بس یہ خط ملا ہے۔

اسے کیسے پتا چلا کہ آپ کا پہلا بیٹا تین سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ میری عمر تیس سال ہے، ثریا پندرہ کی ہے۔ آپ ایک سکول میں پڑھاتے ہیں۔ آپ تین سال بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ اور.... کچھ دوسری باتیں.... میں نے سوالوں کی بوچھار کر دی۔

بے بس ہو کر منت کی۔

انھوں نے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا۔ ٹھنڈی آہ بھری۔ ایک پل کے لیے آنکھیں بند کیں۔ ایک ثانیے سے کم وقفے کے لیے ان کی پلکیں شدت سے لرزیں اور پھر کھلیں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے جلدی جلدی اسے پڑھا۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں بس اتنا کہہ سکا۔

اب میں چپ تھا اور وہ تینوں میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اب میں سمجھا کہ میں نے کس احساس کے تحت خود کو ان سب سے لاتعلق محسوس کیا تھا۔

کیا یہ سچ ہے؟ میں نے خاموشی توڑی۔ اماں آپ بتائیے۔ آپ ہی بتا سکتی ہیں۔

انھوں نے آنسو بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

ابا آپ بتائیے کیا یہ سچ ہے؟ میں نے اپنے لہجے میں اب غصہ محسوس کیا۔

ابا نے چھوٹی بہن سے کہا کہ وہ کمرے میں چلی جائے۔

میں نے دوبارہ وہ تحریر پڑھی۔

اتنا سچ ہے کہ تمھاری ماں کا نکاح اس سے ہوا تھا، مگر وہ سات سال تک غائب رہا۔ سب نے کہا کہ وہ جنگ میں مارا گیا ہے۔ سب نے یقین بھی کیا۔ اس کے بعد تمھارے نانا نے امیراں کی شادی مجھ سے کر دی۔ اب وہ کہتا ہے کہ....

کیا وہ خود آیا تھا؟ میں نے ابا کو پوری بات نہیں کرنے دی۔

نہیں۔ بس یہ خط ملا ہے۔

اسے کیسے پتا چلا کہ آپ کا پہلا بیٹا تین سال کی عمر میں فوت ہو گیا۔ میری عمر تیس سال ہے، ثریا پندرہ کی ہے۔ آپ ایک سکول میں پڑھاتے ہیں۔ آپ تین سال بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ اور.... کچھ دوسری باتیں.... میں نے سوالوں کی بوچھار کر دی۔

اسے میری اور اس گھر کی ایک ایک بات معلوم ہے۔ میں نے پی ٹی سی کیا، مگر نوکری نہیں کی۔ اماں نے بسورتے ہوئے میری بات آگے بڑھائی۔

اسے یہ بھی پتا ہے کہ میں شہر میں پڑھتا ہوں اور ثریا ابھی گاؤں کے سکول میں ہے۔ کیا اسے پہلے دن سے سب معلوم تھا؟ اگر تھا تو وہ آپ دونوں کی شادی کے وقت آ کیوں نہیں گیا؟ اتنا عرصہ انتظار کیوں کیا؟

ہوسکتا ہے اس نے یہ سب اب معلوم کیا ہو؟ اماں بولیں۔

خدا جانے وہ کیا چاہتا ہے؟ ابا بس اتنا کہہ سکے۔

وہ اتنا برا آدمی نہیں تھا۔ جنگ میں شاید اس کا دماغ چل گیا ہو۔ اماں نے قیاس آرائی کی۔

جنگ میں اس کا دماغ چلا یا نہیں، لیکن اب اس کی نیت ٹھیک نہیں لگتی۔ میرے لہجے میں تلخی تھی۔

ابھی ہم اس خط کا ذکر کسی سے نہیں کریں گے۔ میں خاموشی سے تمھارے نانا سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسے بھی اس کا کوئی خط ملا یا اتا پتا ہے۔ ابا یہ کہہ کر اٹھے اور نماز پڑھنے چلے گئے۔

مجھے اماں سے اس کے بارے میں تفصیل سے بات کرنی چاہیے کہ نہیں۔ ابا کے جانے کے بعد میں کچھ دیر اس کش مکش میں رہا۔ اماں سے اس کے بارے میں سوال کرنے کا مطلب ..... میں اماں کو ایک لڑکی سمجھنے کے خیال ہی سے لرز اٹھا اور فوری طور پر اس کا سبب سمجھنے سے قاصر رہا۔ لیکن اماں کبھی ایک لڑکی تھی۔ میں اس سچائی سے انکار کرسکتا ہوں؟ خط میں دو سطریں ایسی ہیں، جو مجھے یہ سوچنے پر مجبور کررہی ہیں۔ لیکن میں ڈر کیوں رہا ہوں؟ یہ ڈر اماں کے ماضی کے بارے میں سوچنے کا پیدا کردہ ہے؟ .... یا میں لڑکیوں کے بارے میں ...... مجھے فوراً کچھ لڑکیاں یاد آئیں .... شیما .... روشنی .... اماں ان جیسی کیسے ہوسکتی ہے؟ پر یہ دو سطریں .... 'امیراں نے قرآن پر

ہاتھ رکھا تھا کہ وہ کسی اور سے شادی نہیں کرے گی'۔اتنی بڑی بات.....ابا کے علاوہ....توبہ.....یہ نہیں ہوسکتا...اماں....لڑکی....ایک ہاتھ قرآن پر دوسرا اس کے ہاتھ میں دے کر.....تمھارے علاوہ کسی سے شادی نہیں کروں گی.....یہ نہیں ہوسکتا.....یہ کیسے ہوسکتا ہے؟؟ ہوسکتا ہے.....

اگر خط میں لکھی ہوئی باقی باتیں سچ ہیں تو یہ غلط کیسے ہوسکتی ہے؟ آدمی کا کیا بھروسا۔وہ ننانوے سچ اور ایک جھوٹ بول سکتا ہے اور یہی ایک جھوٹ ننانوے سچ کی گردن کاٹ سکتا ہے۔میں نے محسوس کیا کہ اماں کے سلسلے میں مَیں اصل سچائی کا سامنا کرنے سے ڈر بھی رہا ہوں اور اس کا سامنا کرنے پر خود کو مجبور بھی پا رہا ہوں۔ابھی اماں نے کہا ہے کہ وہ برا آدمی نہیں تھا۔کہیں نہ کہیں اماں اب بھی اس کے لیے نرم گوشہ رکھتی ہے۔میں نے دل میں جنون محسوس کیا۔

میں اٹھ کر چلنے لگا۔

مجھے سمجھ نہیں آتا، وہ اتنا عرصہ غائب کہاں رہا؟ اور ایک ایک بات کی ٹوہ میں بھی رہا۔

اگر اتنے سال اس نے گزار لیے تو باقی عمر بھی گزار لیتا۔اماں نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میرا جی چاہتا ہے، وہ ملے تو اس کا گلا گھونٹ دوں۔میں نے اپنے جنون کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

اور میرا دل کرتا ہے کہ میں اپنا گلا گھونٹ لوں۔اماں کے لہجے میں غصہ، رنج، مایوسی بہت کچھ تھا۔

اماں کیا یہ سچ ہے کہ آپ نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا تھا؟ میں خود پر قابو نہیں رکھ سکا، اور وہ سوال پوچھ ڈالا جس سے اب تک بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اماں کافی دیر چپ رہیں۔

میں چاہتا تھا کہ اماں بس اتنا کہہ دیں کہ یہ جھوٹ ہے۔میری اور ثریا کی ذات داؤ پر لگ چکی تھی۔یہ اماں کو معلوم ہوگا مگر.....

تم مجھ سے یہ سوال کیوں کر رہے ہو؟

اماں کے لہجے میں ایک خاص طرح کی رنج آمیز سنجیدگی تھی جس نے مجھے نانا اللہ داد کی یاد دلائی۔ وہ بھی جب کسی نزاعی مسئلے پر بات کرتے تو ان کا چہرہ تن جاتا اور آواز گہری ہو جایا کرتی تھی اور سننے والے کو خاموشی اور احترام پر مجبور کرتی۔

یہ سوال تو تیرے ابا نے بھی آج تک نہیں کیا۔ انھوں نے خط پڑھا، مجھے پڑھنے کے لیے دیا۔ صرف اتنا کہا: کاش پہلے معلوم ہو جاتا کہ وہ زندہ ہے۔

ابا کی بات اور ہے۔ ان کے سنجیدہ لہجے نے مجھے اپنی حیثیت کا احساس دلایا۔ میں کچھ دیر چپ رہا۔ پھر شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ اتنا بتا دیں.... میں ایک لمحے کو رکا.... آنکھیں جھکا لیں.... اتنا بتا دیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ نکاح ٹوٹ سکتا ہے، قسم نہیں؟ میں نے خط کی دوسری سطر اماں کے سامنے رکھی، جو مجھے ادھیڑ رہی تھی۔ اگر قسم اب تک باقی ہے تو میں ابا، ثریا اور میرا آپ سے تعلق....

یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ اماں تڑپ کر بولی۔

اسی دوران ابا نماز پڑھ کر واپس آ گئے تھے۔

تمھیں اپنی ماں سے اس طرح کی بات نہیں کہنی چاہیے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابا نے نرمی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس حالت سے باہر آ گئے ہیں، جس میں انھیں کوئی ایک گھنٹہ پہلے دیکھا تھا، یا شاید انھوں نے کوئی حل تلاش کر لیا تھا، یا پھر انھوں نے معاملات کو خدا پر چھوڑ دیا تھا۔

ابا، آپ نے پورا خط غور سے پڑھا ہے؟ میں اس حالت سے نہیں نکل پا رہا تھا، جس میں گھر پہنچتے ہی گرفتار ہو گیا تھا۔

پڑھا ہے۔ اچھی طرح پڑھا ہے۔ انھوں نے میرا کاندھا تھپتھپایا۔ میں نے خود کو کمزور محسوس کیا۔

میں نے امام صاحب سے پوچھا ہے۔ اگر چار سال تک کسی کی خیر خبر نہ ملے تو نکاح خود

یہ خود ختم ہو جاتا ہے۔ ابا نے گویا مجھے تسلی دی۔

لیکن وہ قسم اور....؟ تیسری سطر کا میں ذکر کرنے کی اس پل ہمت نہیں کر سکا۔

یہ معاملہ امیراں کا ہے، اس کے دل کا، اس کا ہم سے تعلق نہیں۔ ابا نے ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

مگر اس نے لکھا ہے کہ نکاح ٹوٹ سکتا ہے، قسم نہیں۔

ٹھیک لکھا ہے۔ مجھے نہیں معلوم قسم ٹوٹتی ہے کہ نہیں، پر یہ ضرور جانتا ہوں کہ اس کا کفارہ ہوسکتا ہے۔ ابا کے لہجے میں اعتماد برقرار تھا۔

کیا اماں نے کفارہ......؟

میری جان! تم پوچھنا کیا چاہتے ہو؟ ابا نے مجھے اپنے پاس چارپائی پر بٹھاتے ہوئے کہا۔

اس نے لکھا ہے کہ امیراں نے قرآن پر قسم کھائی تھی کہ وہ اسی سے شادی کرے گی۔ نکاح زبان سے ہوتا ہے، وہ ٹوٹ سکتا ہے، ختم ہوسکتا ہے، لیکن وہ قسم نکاح سے بڑی تھی، دل اور خدا کو حاضر ناظر جان کر اور خدا کے کلام پر اٹھائی گئی تھی.... نکاح ٹوٹ گیا، قسم نہیں... میں نے بڑی مشکل سے وہ سب کہا، جس نے مجھے بے بس کر دیا تھا۔ میرے منہ سے پہلی مرتبہ امیراں نکلا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ سے زیادہ تنہا دنیا میں کوئی نہیں۔ میں ماں باپ کے بغیر ہوں۔

امیراں کسی کی نہیں۔ نہ اصغر کی، نہ ثریا کی، نہ شمس کی، نہ اکبر کی، نہ اللہ داد کی، نہ بہشتن ماں کی۔ اماں نے سب سے خود کو لاتعلق کر لیا۔

یہی سننا چاہتے تھے، تم؟ ابا نے مجھے ڈانٹا۔

ہم میں سے کسی نے کھانا نہیں کھایا۔ وہ رات بہت بھاری تھی۔ ہم سب پر۔

''تیز بارش ہو رہی ہے اور اس سے زیادہ تیز ہوا چل رہی ہے۔ شیر کی دھاڑ جیسی آواز ہر طرف گونج رہی ہے۔ میں مشکل سے اٹھتا ہوں۔ بار بار لڑکھڑاتا ہوں اور پیچھے کی طرف گرتا

ہوں۔ میرے سینے پہ جیسے برف کی سل رکھ دی گئی ہے۔ اکھڑے سانس کے ساتھ کھڑکی کا ایک پٹ پکڑنے میں کامیاب ہوتا ہوں۔ اسے بند کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس بار پانی کی تیز دھار میرے چہرے پر کٹار بن کر پڑتی ہے۔ میرے کپڑے لہو سے تر ہو جاتے ہیں۔ چیخنے کی کوشش کرتا ہوں، مگر گلے سے آواز نہیں نکلتی، میرا دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے"۔

آنکھ کھلی تو میں رو رہا تھا اور گلا رندھا ہوا تھا۔ اٹھا، باہر صحن میں آیا۔ آسمان پر تارے مدھم ہونے لگے تھے۔ ہلکا ہلکا اجالا پھیلنے کی سعی کر رہا تھا۔ صحن میں جہاں شیشم اور بکائن کے درخت ہیں، اس سے ذرا آگے دیوار کے پاس تنور ہے۔ اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ میں نے ضبط کا بندھن ٹوٹنے دیا۔ میرے رونے کی آواز سے درختوں پر ہلکی سی ہلچل ہوئی۔ اٹھا، صحن میں چکر لگانے لگا، احتیاط کے ساتھ۔

ایک خط.....کاغذ کا ایک پرزہ.....زندگی جہنم بنا سکتا ہے.....یہ پہلا خیال تھا جو مجھے سوجھا۔ اس پر لکھی تین سطریں تمھیں اس تنور میں پھینک دیتی ہیں جس کا بالن آدمیوں کی ہڈیاں ہیں۔

سب کچھ جانا پہچانا.....اپنا.....مانوس.....معمول.....بس پل بھر میں چھن گیا.....ریت کی دیوار ہے یہ معمول.....ایک تیز جھونکا اسے بکھیر دیتا ہے.....ہمارے پاؤں کس کمزور، بے یقین مٹی پر ہیں.....نیچے جہنم ہے.....ہر وقت اپنی طرف کھینچنے کے لیے تیار.....تم مقابلے کے امتحان میں بیٹھو گے.....ابا کہتے ہیں.....نہیں.....جیسے تمھاری مرضی.....اماں کہتی ہیں.....اماں میری مرضی کرنے کے حق میں.....اس لیے کہ انھوں نے بھی مرضی کی تھی؟ جیسے ہی یہ خیال آیا.....میں نے ادھر ادھر دیکھا .....درختوں کی شاخیں کچھ کچھ دکھائی دینے لگی تھیں، مگر پراسراری.....جیسے وہ میرے ذہن میں گھس رہی ہوں.....پرندے جاگنے لگے تھے.....مجھے اماں کے اس زمانے کے بارے میں سوچنے کا حق ہے؟ میرا اس زمانے سے کیا تعلق ہے؟.....جب میں تھا نہ میرا خیال.....اس بھری دنیا میں کسی کے ذہن میں بھی موہوم سا خیال تک نہ تھا کہ ایک اصغر نام کا لڑکا ہوگا.....جب اماں، امیراں تھی.....ایک

لڑکی ....میرا سر پھٹ جائے گا...اماں ....لڑکی ....نہیں نہیں....میں اماں کا ابا کے بغیر تصور نہیں کر سکتا.....جہنمی شمس کہاں سے آ گیا.....وہ دونوں سکھ تھے...سانولے تھے..کینیڈا میں پندرہ سالوں سے مقیم تھے...وہیں ملے تھے.....دس سال بعد بیٹا پیدا ہوا تو چٹا گورا تھا۔شوہر نے شور مچایا....ڈی این اے سے ثابت ہوا کہ اسی سانولے سکھ کی اولاد ہے.....بیوی نے علیحدگی اختیار کر لی...جس شخص کو دس سالوں میں میری زبان اور میرے کردار پر اعتماد نہیں، وہ میرا شوہر نہیں رہ سکتا....شوہر کے پاس اپنی دلیل تھی.....وہ میرے بستر پر میرے ساتھ ہی کسی اور کے ساتھ سوتی تھی....میاں بیوی دونوں کے پاس اپنی اپنی دلیل تھی.....بچے سے کس نے پوچھا؟.....میں اور ثریا....کس سے پوچھیں؟.....ابا کہتے ہیں تم مقابلے کا امتحان دینا....ایس پی بننا....کیا اس لیے کہ ایک دن میں شمس کو پکڑ سکوں.....اور قتل کر دوں.....؟ کیا دنیا میں کوئی ایک شخص ایسا ہے جو اپنی ذات کے علاوہ سوچ سکے؟....کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا ہے، جو جان سکے کہ میں اس وقت کیا محسوس کر رہا ہوں..؟ ثریا کہتی ہے بھائی تم ہر چھوٹی چھوٹی بات بہت محسوس کرتے ہو۔حد سے زیادہ حساس ہو۔

میں نے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو کمرے میں چلا آیا۔ابا تہجد کے لیے وضو کرنے آئے تھے۔

انھوں نے مجھے دیکھا، کچھ پوچھا نہ کچھ کہا۔

شمس دنیا میں ہے ہی نہیں تو اس کے خط لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔اس جنگ میں صرف ایک آدمی بچا تھا۔وہ بھی اسی قصبے کا تھا۔بشیر...شاید یہی نام تھا۔اس کا ایک پاؤں زخمی ہوا تھا۔اس نے بھی شمس کے مارے جانے کی اطلاع دی تھی۔نانا نے کہا، جنھیں اماں نے بلا بھیجا تھا۔

پھر کس نے لکھا ہے؟

کسی دشمن نے۔میرے پوچھنے پر نانا نے کہا۔

ہمارا کون دشمن ہو سکتا ہے؟

کوئی بھی۔ دشمن بننے میں کیا دیر لگتی ہے؟ دیر تو دوست بننے میں لگتی ہے۔

یہ چھوٹی سی بات پر پریشان ہے۔ پولیس افسر بنو گے تو اس سے بڑے بڑے مسائل آئیں گے۔ آپ کی ماں نے چچا اللہ داد کو خواہ مخواہ تکلیف دی ہے۔ ابا نے کہا۔ وہ پرسکون تھے۔

اور اگر واقعی اسی نے لکھا ہو؟ اور جو لکھا ہے وہ سب سچ ہے...تو...؟ میری پریشانی ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔

اگر دوسرا خط آیا تو دیکھیں گے۔ نانا نے گویا مسئلے پر بحث ختم کرتے ہوئے کہا۔

ہو سکتا ہے یہ خط بشیر نے لکھا ہو، شرارتاً۔ ابا نے شرارت کے لہجے میں کہا۔ اسے شمس نے شاید سب کچھ بتایا ہو۔ ابا شاید مجھے پریشانی سے نکالنا چاہتے تھے۔

اب میں صرف ایک بات کا منتظر رہنے لگا کہ کب دوسرا خط آئے۔ دوسرا خط نہیں آیا۔

یہ خط مجھے دے دیں۔ ایک دن ابا نے کہا۔

مجھے اس کی نقل بنوانے دیں۔ میں نے ضد کی۔

چھوڑیں ضائع کر دیتے ہیں۔ جب تک گھر میں رہے گا، تکلیف دیتا رہے گا۔ ابا نے اصرار کیا۔

کوئی دوسرا خط آیا نہ اس کے بعد گھر میں اس خط کا ذکر ہوا۔ لیکن میرے ذہن سے وہ دو سطریں ہمیشہ کے لیے چپک کر رہ گئی ہیں۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا، جب ان سطروں کا کوئی نیا مطلب ذہن میں پیدا نہ ہوا ہو۔

اماں....ایک عام لڑکی تھی، جس نے قسم کھالی۔

ابا یہ سب جانتے ہوئے بھی پرسکون ہیں۔ کیا وہ اماں سے اتنی محبت کرتے ہیں؟

اماں کے دل میں شمس اب تک بستا ہوگا؟ یہ سوچتے ہی وہ مجھے اماں نہیں امیراں لگتی ہیں، جس کے تعلق سے میں اپنے جذبات کو ٹھیک ٹھیک سمجھ تک نہیں سکتا۔

وہ خط آخر کس نے لکھا ہوگا؟ یہ سوال مسلسل تنگ کرتا ہے۔ میں نے خاموشی سے اماں کے گاؤں کے ایک ایک شخص کے بارے میں معلومات حاصل کی ہیں۔ بشیر پرائمری پاس ہے اور وہ اماں کا نام تک نہیں جانتا۔ کریانے کی ایک چھوٹی سی دکان کرتا ہے۔

پھر کون ہے جو اماں کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے؟ ایک دن یہ سوال شدت سے پیدا ہوا۔

کہیں وہ ابا تو نہیں ہیں؟ میرے ذہن یہ خیال ایسے چمکا اور ایک ایسی حیرت میں نے محسوس کی، جیسے کسی صدیوں پرانے معمے کا حل تلاش کر لیا ہو۔

پر ابا نے کیوں لکھا ہوگا؟ اب تک میں اماں ہی کو ایک لڑکی سمجھ کر ان کے بارے میں سوچتا آ رہا تھا۔ پہلی بار خیال آیا کہ ابا..... ایک مرد بھی تو ہیں۔

شاید اس لیے لکھا ہو کہ انھیں... کبھی یہ محسوس ہوا ہو کہ اماں نے شمس کو بھلایا نہیں۔ اماں نے اس دن ہم دونوں کے سامنے کہا تھا کہ شمس برا آدمی نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کبھی یہی بات اماں نے ابا سے پہلے بھی کہی ہو؟

شاید ابا چاہتے ہوں کہ اماں یقین کر لیں کہ شمس واقعی برا آدمی تھا۔ اس کے برے ہونے کے یقین ہی میں ابا خود کو اچھا ثابت کرنا چاہتے ہوں؟

ہر ماں باپ کی دو زندگیاں ہوتی ہیں۔ وہ آخری دم تک مرد عورت کی زندگی بھی جیتے ہیں۔ اولاد کو بس ان کی ایک زندگی سے تعلق رکھنا چاہیے۔ جس دن یہ بات مجھے سمجھ آئی، میں نے اس خط کے بارے میں جاننے کا تردد ختم کر دیا۔

گم نام خط

کرسی پر نیم دراز جب اس نے مکتوب نگار کا نام ایک سے زیادہ بار دیکھا اور اسے یقین ہوگیا کہ اس کا سامنا واہمے سے نہیں تو وہ مسکرادیا تھا، اور وہ تفکر کچھ لمحوں کے لیے جاتا رہا تھا جو خط میں لکھی گئی باتوں کا پیدا کردہ تھا۔ ٹھیک جس وقت وہ مسکرایا تھا، اسی وقت اسے تین باتیں آگے پیچھے یا ساتھ ساتھ سوجھی تھیں۔ ہوسکتا ہے یہ خط اسی نے لکھا ہو جس کا نام لکھا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ جس کا نام خط کے آخر میں درج ہے، وہ جانتا ہی نہ ہو کہ کوئی خط لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خط تو اسی شخص نے لکھا ہو جس کا نام مکتوب نگار کے طور پر لکھا گیا ہو مگر اسے یہ معلوم نہ ہو کہ خط کسے لکھا گیا ہے۔ جیسے ہی یہ تینوں باتیں اس کے ذہن میں دہرائی گئیں، وہ قدرے سنجیدہ ہوگیا۔ یہ ایک عام واقع ہونے والی بات نہیں ہے، اس نے خود سے کہا۔ جس شخص کا نام خط میں لکھا گیا ہے، اگر اسے معلوم ہی نہیں کہ کوئی خط لکھا گیا ہے تو اس کی یہ جہالت کسی حادثے کا پیش خیمہ ہوسکتی ہے۔ نام کے ساتھ آدمی آخر کہاں تک چھپ سکتا ہے؟ اس صدی کا سب سے بڑا انقلاب یہی ہے کہ چھپنے کی جگہیں کم سے کم ہوگئی ہیں، اور ان سب کے لیے تو بہت کم ہیں جو کچھ بھی لکھتے ہیں۔ ہر تحریر سانپ کی اس لکیر کی طرح ہے جو کسی نہ کسی نام تک پہنچ کر دم لیتی ہے۔ وہ ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔ لیکن اس بار وجہ دوسری تھی۔ ابھی ابھی ہونے والا انکشاف۔ اس سے پہلے اسے جتنے خطوط ملے تھے، سب گم نام تھے۔ پر تھے تو سانپ کی لکیر کی طرح! لیکن فی الوقت وہ گم

نام خطوں کے بارے میں نہیں سوچنا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پہلے اس خط سے پیدا ہونے والی سنجیدگی کو پوری طرح سمجھ لے۔ ورنہ یہ بات خود اس کے لیے بھی اتنی ہی بڑی مصیبت کھڑی کر سکتی ہے، جتنی اس شخص کے لیے جس کا نام خط میں لکھا گیا تھا، مگر اسے معلوم نہیں تھا۔ اسی دوران میں چپراسی کمرے میں شام کی چائے لیے حاضر ہوا۔ اس نے چائے کو دیکھا چپراسی کی طرف نہیں۔ اس سے پوچھا کہ یہاں آخری بار سیلاب کب آیا تھا؟ ابا کی جس سال شادی ہوئی تھی ....کوئی تیس سال پہلے، سر۔ چپراسی نے حساب کر کے بتایا۔ چپراسی حیران ہو کر چلا گیا۔ واپسی پر اس نے دروازہ بند کیا تو اس کی توجہ میں تھوڑا سا خلل پیدا ہوا۔ یہ خلل اس وقت بے اثر ہو گیا جب اس نے چائے کا پہلا گھونٹ بھرا۔ چائے گرم تھی اور الائچی کے ساتھ چائے کی مخصوص خوشبو کی حامل تھی۔ گزشتہ ایک گھنٹے میں ہونے والے واقعات میں سب سے خوشگوار بات یہی تھی۔ اس نے خط کے مندرجات پر پھر نظر ڈالی جو نام پر آ کر رک گئی۔ اگر یہ خط اسی آدمی نے لکھا ہے جس کا نام قیصر درج ہے تو پھر میرے لیے پریشانی کا باعث ہے، جب کہ میرے ان دو دوستوں کے لیے تشویش کا باعث ہے جن کے نام کے ساتھ قیصر آتا ہے۔ اس نے سوچا۔ قیصر علی انجینئر ہے، جو ایک سول ورکس کی کمپنی میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے لکھنے پڑھنے سے کبھی واسطہ نہیں رہا۔ یہی معاملہ فرقان قیصر کا ہے جو فزکس کا پروفیسر ہے۔ لیکن خط ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے لکھنے پڑھنے کی عادت ہرگز ضروری نہیں۔ یہ خیال آتے ہی اس نے چائے کی پیالی میز کے ایک کونے پر رکھی اور خط کو میز پر پھیلا کر کرسی سے اٹھا اور اس بڑے کمرے میں چلنے لگا جو اس کا دفتر ہے اور جہاں وہ شام پانچ بجے تک بیٹھنے کا عادی ہے۔

خط لکھنے کے لیے کوئی خصوصی مہارت نہیں چاہیے۔ کیسی عجیب بات ہے! دنیا میں شاید ہی کوئی آدمی ہو جس نے کبھی خط نہ لکھا ہو۔ جو سرے سے لکھنا ہی نہیں جانتے وہ بھی خط لکھ لیتے ہیں۔ زبانی پیغام بھی خط نہیں تو اور کیا ہے۔ جس دیوار میں دفتر کا دروازہ بنایا گیا ہے، اس کے

دائیں کونے میں کتابوں کا شیلف ہے۔ وہ جب شہر سے یہاں پہلی بار آیا تھا تو کوئی درجن بھر کتابیں ساتھ لایا تھا۔ آدھی اس نے اپنی قیام گاہ میں رکھی تھیں، آدھی یہاں۔ حالاں کہ یہاں اسے ان کتابوں کو پڑھنے کا وقت کم ملتا، مگر وہ مطمئن تھا کہ یہ کتابیں اسے برابر احساس دلاتی ہیں کہ انھیں پڑھا جانا چاہیے۔ وہ ان کتابوں کے عنوانات اور مصنفین کے نام دیکھ رہا تھا۔ حالاں کہ یہ دونوں باتیں اسے ازبر تھیں۔ اسے اچانک یاد آیا کہ اس نے چند سال پہلے لائبریری سے ایک کتاب لے کر پڑھی تھی جس پر دو مصنفوں کے نام درج تھے۔ وہ چونک گیا تھا کہ ایک ناول کو دو آدمی کیسے لکھ سکتے ہیں؟ اس کا جواب اسے کتاب کا ابتدائیہ پڑھتے ہی مل گیا۔ ڈیڑھ صدی تک وہ کتاب ایک شخص کے نام سے شایع ہوتی رہی۔ پھر اچانک ایک شخص نے تحقیق کی تو پتا چلا کہ اس کا اصل مصنف کوئی اور ہے۔ پھر دونوں کے نام کتاب کے سرورق پر کیوں؟ اس سوال سے وہ پریشان ہوا تھا۔ اس کا جواب بھی اسی محقق نے دیا تھا، لیکن وہ اس کی دلیل سے متفق نہ ہو سکا تھا۔ چوں کہ لوگ ایک طویل عرصے تک ایک فرضی مصنف کو اصلی مصنف سمجھ کر کتاب پڑھتے آئے ہیں، اس لیے اگر صرف اصلی مصنف کا نام دیا جاتا تو ان لوگوں کو صدمہ پہنچتا جو اس کتاب کو فرضی مصنف کی اصلی کتاب سمجھ کر پڑھتے آئے ہیں۔ 'تو تحریر واقعی سانپ کی لکیر کی مانند ہے جو کبھی نہ کبھی....'۔ اس نے تھوڑی دیر پہلے سوچی ہوئی اپنی ہی دلیل کو دہرایا۔ اسے ملنے والا نیا خط اور وہ کتاب..... دو ایسے واقعات ہیں جو ایک ہی طرح سے وقت کے فرق کے ساتھ وقوع پذیر ہوئے ہیں۔ شیلف کے سامنے کھڑے ہوئے، اس کی نظر کتابوں پر تھی مگر دھیان ابھی اس کتاب کی طرف تھا۔ اسے اس کتاب کی فوٹو کاپی کروالینی چاہیے تھی۔ وہ اس وقت اس کی مدد کر سکتی تھی۔ خیر میں اسے یاد کر سکتا ہوں۔ اس کتاب کی کہانی بہت دل چسپ مگر المناک تھی۔ اس لیے اسے یاد رہ گئی تھی۔ وہ ایک نوجوان کی کہانی تھی جو بچپن میں والدین سے بچھڑ گیا تھا۔ پہلے اسے ایک ملاح نے پالا۔ جب ملاح مرا تو وہ چھ سال کا تھا۔ اسے ایک تاجر اپنے ساتھ لے گیا، جس نے

اپنے سامان تجارت میں اسے بھی شامل کرلیا۔ چھ سال تک وہ کئی ہاتھوں سے ہوتا ہوا اور اپنی کمر میں شدید اذیت سہتا ہوا وہ ایک قصاب کے پاس پہنچا، جس نے اسے جانور ذبح کرنے کا فن سکھایا۔ جب وہ بیس سال کا ہوا تو اس نے ایک راجہ کی ملازمت کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب اس سے اتا پتا پوچھا گیا تو اس نے اپنی کہانی تو سنا دی، مگر یہ نہ بتا سکا کہ وہ کون ہے، اس کا اصلی نام کیا تھا اور وہ کہاں کا رہنے والا ہے۔ اس نے بتایا کہ ملاح اسے چنو کہتا تھا، تاجر نے اسے چاند کا نام دیا۔ چھ سال تک وہ چاند رہا۔ جب وہ قصاب کے پاس آیا تو اس نے خود اپنا نام بدل کر زبیر رکھ لیا۔ اس نے راجہ کے درباری سے کہا کہ وہ اسے تاجر کے دیے گئے نام کے سوا کسی بھی نام سے ملازمت دے دیں۔ یا اگر چاہیں تو کوئی نیا نام رکھ دیں۔ اسے فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ہمیں فرق پڑے گا۔ درباری نے کہا جسے وہ نوجوان صحیح معنوں میں سرد و گرم چشیدہ لگا تھا۔ جب اس نے پوچھا کہ کیا فرق پڑے گا تو درباری نے نہایت سنجیدہ چہرہ بنا کر کہا: سب کچھ نام میں رکھا ہے۔ دربار میں ساری چھوٹی بڑی جنگیں نام پر اور نام کے لیے لڑی جاتی ہیں۔ جب راجہ تبدیل ہوتا ہے تو وہ پرانے نام بدل دیتا ہے اور نئے نام رکھتا ہے۔ پھر تو راجہ اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔ وہ کیسے؟ درباری اس کے سوال پر چونکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نوجوان کچھ کہتا، درباری مسکرا دیا۔ ٹھیک ہے، تم راجہ کو دیس دیس کے قصے سنایا کرو گے۔ بس یہ احتیاط کرنا کہ جس وقت راجہ کے چہرے پر معمولی سا بھی تناؤ دیکھو، قصہ ختم کر دینا۔ وہ حیرت میں تھا کہ اسے اس کتاب میں پڑھی ہوئی کہانی کس طرح تفصیل سے یاد آ گئی تھی، لیکن ایک بات نے اسے کتاب پڑھتے وقت نہیں، اس کی کہانی یاد کرتے ہوئے پہلے متعجب کیا اور پھر وہ اس پر مسکرا دیا تھا۔ وہ کتاب کسی مغربی کتاب کا اردو ترجمہ تھی۔ مترجم نے اس نوجوان کے کتاب میں لکھے گئے مغربی ناموں کو اردو ناموں سے بدل دیا تھا۔ یہ تعجب کی بات تھی، لیکن وہ مسکرایا کہانی کے نوجوان کی قسمت پر۔

جگہیں اور زمانے اور پھر واقعات ایک جیسے۔ جن پر واقعات گزرتے ہیں، وہ بھی

ملتے جلتے۔ یہ کیا کہانی ہے، کیا قصہ ہے، کیا معما ہے یا نرا کھیل ہے؟ کیا کوئی کہیں یہ کہانی لکھ رہا ہے یا کہیں قرنوں پہلے لکھی کہانی، یہاں وہاں، آگے پیچھے بس کھل رہی ہے؟ کون بتائے؟ اس نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔ اس کتاب کے مصنف کے دھیان میں کبھی یہ بات آئی ہوگی کہ وہ جس نوجوان کی کہانی لکھ رہا تھا، خود اس کی اپنی کہانی بھی اس سے مختلف نہیں ہوگی۔ کیا پتا مصنف نے ذرا بدل کر اپنی ہی کہانی لکھی ہو اور پھر یہ اہتمام بھی کیا ہو کہ اس پر اپنے اصلی نام کے بجائے فرضی مصنف کا نام لکھ دیا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے اسے ایک بات کا افسوس ہوا کہ وہ کتاب پڑھتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کر سکا تھا کہ وہ کتاب کیسے کسی فرضی مصنف سے منسوب ہوئی۔ اب وہ صرف قیاس سے کام لے رہا تھا۔ اسے اس کتاب پر تحقیق کرنے والے کی وہ بات دوبارہ یاد آئی جس میں اس نے کہا تھا کہ اس نے فرضی مصنف کا نام اس لیے رہنے دیا کہ پڑھنے والوں کو صدمہ نہ ہو۔ حالاں کہ پڑھنے والوں کو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ان کی محبوب کتاب کو اس کا اصلی مصنف مل گیا ہے۔ اس محقق نے کس وجہ سے یہ بات لکھی تھی؟ کیا پڑھنے والے مصنف سے جذباتی طور پر وابستہ ہو جاتے ہیں؟ مصنف جو اصل میں صرف ایک نام ہے۔ اسے ایک انوکھی بات سوجھی۔ اس نے اس کتاب کے ایک فرضی قاری کا تصور کیا جس نے وہ کتاب دو بار پڑھی تھی۔ پہلے فرضی مصنف کے نام کے ساتھ اور اب اصلی مصنف کے نام کے ساتھ۔ اس کے دونوں ناموں کے لیے کس قسم کے جذبات ہوں گے؟ ہو سکتا ہے اسے اصلی مصنف کا نام جان کر خوشی ہوئی ہو، مگر ساتھ ہی فرضی مصنف سے ہمدردی پیدا ہوئی ہو۔ اس فرضی مصنف کی حالت اس راجہ کی سی ہوگی، جسے اپنی آخری عمر میں پتا چلے کہ وہ جس ملک پر حکومت کر رہا تھا، وہ ملک دنیا کے نقشے پر موجود ہی نہیں۔ وہ طویل عمر تک ایک کھیل میں راجہ بنا ہوا تھا، مگر یقین کر رہا تھا کہ وہ ایک اصلی تخت پر، اصلی درباریوں کے ساتھ حقیقت میں احکامات صادر کر رہا تھا۔

اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوچا کہ اس بات پر کیسے یقین کیا جائے کہ اس نے شیلف

میں جو کتابیں دیکھی ہیں، ان پر لکھے گئے مصنفوں کے نام اصلی ہیں یا فرضی؟ اس نے کرسی کے دستے پر ہاتھ رکھا، اس خط کو ہاتھ میں پکڑا، میز پر بایاں ہاتھ پھیرا۔ پیپر ویٹ اٹھایا۔ میز کے شیشے پر ہلکی سی ضرب لگائی۔ اس کے ساتھ بیل بجائی۔ دروازہ چیں کے ساتھ کھلا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ سب کچھ فرضی نہیں ہے۔ اس یقین کے ساتھ وہ اٹھا، چپراسی نے چند فائلیں اٹھائیں۔ دونوں کالج کی چار دیواری ہی میں موجود اس کی قیام گاہ کی طرف بڑھے۔

اسے یہاں آئے ہوئے چھ ماہ ہو چکے تھے۔ وہ صرف دو مرتبہ بیوی بچوں سے ملنے گیا تھا۔ اسے گم نام خطوط اس واقعے کے بعد ملنا شروع ہوئے جسے وہ بار بار یاد کرنے سے اب کچھ کچھ گھبرانے لگا تھا۔ اسے سب نے منع کیا کہ اس قبر تک جانے کا راستہ تبدیل نہ کرے۔ جو کالج کی حدود میں ایک ٹیلے پر واقع ہے، جس پر پیپل سایہ کیے ہوئے ہے اور جس کے بارے میں اس قصبے کے لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک پہنچی ہوئی عورت کا مزار ہے اور جسے یہاں کثرت سے آنے والے سیلاب بھی نقصان نہیں پہنچا سکے۔ اس کے بارے میں لوگوں میں قصہ تو بس ایک ہی مشہور تھا، لیکن اس پہنچی ہوئی عورت کی موت سے متعلق روایات مختلف تھیں۔ قصے کے مطابق یہاں سے کسی مغل شہزادے کا قافلہ گزرا تھا۔ شہزادے کے نام کی کسی کو خبر تھی نہ دل چسپی۔ اس قافلے نے ایک رات یہاں پڑاؤ کیا تھا۔ شہزادے کے حرم میں درجن بھر عورتیں تھیں جنھیں پورے ہندوستان سے منتخب کیا گیا تھا۔ شہزادے نے رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے خاص الخاص خواجہ سرا کو اس قصبے میں بھیجا کہ وہ یہاں کی سب سے خوب صورت عورت کو تلاش کر لائے۔ خواجہ سرا چند گھڑ سواروں کے ساتھ سیدھا مقامی پنج ہزاری منصب دار کے پاس پہنچا۔ مدعا پیش کیا۔ منصب دار نے ایک سید زادی کے بارے میں بتایا کہ اس سے زیادہ خوبصورت عورت پورے ہند سندھ میں نہیں ہے، مگر شہزادہ دیر سے پہنچا ہے۔ چند دن پہلے ہی اس کی شادی ہوگئی ہے۔ جو شخص شہزادے کو کیسے

پسند آئے گی۔خواجہ سرا جس قدر شہزادے کا مزاج شناس تھا اسی قدر وہ اجنبیوں کی نیت اور بات کے پیچھے چھپے اصل مدعا کو بھانپ لینے والا تھا۔منصب دار کو خدا حافظ کہا اور قصبے کے عام لوگوں سے ملا۔جب واپس آیا تو شہزادے کو اطلاع دی کہ منصب دار کی بیٹی سب سے خوبصورت ہے، مگر وہ چالاک آدمی ہے۔شہزادے نے گھڑسواروں کے ساتھ ہتھیار بند دستہ بھیجا۔منصب دار نے مزاحمت نہیں کی۔صرف اتنا کہہ کر بیٹی ان کے حوالے کر دی: اس نے کبھی شہزادے کا خواب نہیں دیکھا تھا۔خواجہ سرا اس مرتبہ منصب دار کے مدعا کو نہیں پا سکا۔کامیابی کے نشے سے سرشار وہ شہزادے کے پاس پہنچا۔شراب کے نشے سے مست جب شہزادے نے اس کا ہاتھ پکڑا تو اس نے ایک ادا سے ہاتھ چھڑایا اور کہا: میں نے کبھی شہزادے کا خواب نہیں دیکھا تھا، مجھے پہلے یہ خواب دیکھنے دے۔ٹھیک ہے پہلے مجھے دیکھ، پھر آنکھیں بند کر کے میری تصویر ذہن میں لا۔اچھا ہے دونوں نشے میں ہوں۔اس نے چند لمحوں کے تخلیے کی فرمائش کی، جو پوری کر دی گئی۔جب کچھ دیر بعد اسے شہزادے نے طلب کیا تو وہ سجدے میں تھی۔قدرے انتظار کے بعد جب دوبارہ طلبی ہوئی تو پھر وہ سجدے میں تھی۔اسے زبردستی سجدے سے اٹھایا گیا تو تب بھی نہیں اٹھی۔دوسری روایت یہ تھی کہ دو دن پہلے شہزادے کے حرم میں لائی گئی ایک لڑکی نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔تیسری روایت کے مطابق اس نے زہر کھا لیا تھا۔زیادہ لوگ پہلی روایت کو مانتے تھے، اور یہ اضافہ کیا کرتے تھے کہ اللہ کی ولی کے سوا کسی میں غیر اللہ کو ٹھکرانے کی جرأت نہیں۔انھی لوگوں میں اس کالج کے وائس پرنسپل بھی تھے جنھوں نے نئے پرنسپل کو کافی سمجھایا کہ اس عفت مآب کے مزار پر لڑکیاں خاص طور پر آتی ہیں اور صدیوں سے اس تک جانے کا راستہ وہی ہے جہاں کالج کا مین گیٹ بنایا گیا ہے۔وائس پرنسپل نے یہ بھی بتایا کہ اس سے پہلے جس پراجیکٹ ڈائریکٹر نے لوگوں کی مخالفت کے باوجود اس راستے پر مین گیٹ بنایا تھا، اسے بھی سب نے منع کیا تھا مگر وہ وہابی قسم کا بندہ تھا اس لیے اس نے ضد میں گیٹ بنوا دیا تھا اور اس پر چوکیدار بٹھا دیا تھا۔اس کا خیال تھا کہ مین گیٹ کے

بننے سے لوگ مزار پر آنا بند کر دیں گے، کیوں کہ یہ لڑکوں کا کالج ہے لیکن ایسا نہیں ہوا، بلکہ زائر لڑکیوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اور چوکیدار سے ان کے جھگڑے ہونے لگے تھے۔ اسی دوران میں پراجیکٹ ڈائریکٹر کو گم نام خطوط ملنے لگے تھے۔ اس نے ڈر کر ٹرانسفر کرالیا تھا۔ واپسی پر اس کا حادثہ بھی ہوا تھا جس میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ وائس پرنسپل نے یہ بھی بتایا کہ گم نام خطوط اس قدر پراسرار تھے کہ پراجیکٹ ڈائریکٹر راتوں کو اچانک اٹھ بیٹھتا تھا۔ اسے منحوس سپنے آتے تھے۔ پرنسپل کو کہانی دل چسپ ضرور لگی تھی، مگر اس نے راستہ تبدیل کرنے کا ارادہ تبدیل نہیں کیا۔ پرنسپل، وائس پرنسپل اور کالج کے باقی اساتذہ سب دیکھ چکے تھے کہ کالج کے دوران اور چھٹی کے بعد لڑکے مزار کے گرد منڈلاتے رہتے ہیں۔ اس نے کالج کی چار دیواری میں اس جگہ ایک چھوٹا دروازہ بنوادیا جو اس قبر سے چند قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس کے ساتھ ہی قبر کے تین اطراف قدآدم دیوار اٹھوادی۔

اس نے کسی سے ذکر نہیں کیا کہ اسے بھی کچھ دنوں سے گم نام خطوط مل رہے ہیں۔ تاہم وائس پرنسپل جب اس کے دفتر میں کسی کام سے آتے۔ کام کی بات ختم کرنے کے بعد قصبے والوں کی شکایت پہنچاتے کہ انھیں مزار تک پہنچنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ایک تو راستہ لمبا ہو گیا ہے، دوسرا پکی سڑک سے مزار تک کا راستہ اس زمانے سے چلا آتا ہے، جس زمانے تک اس قصبے والوں کی یادداشت جاتی ہے۔ قصبے میں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو یہ کہہ سکے کہ مزار تک پہنچنے کا کوئی دوسرا راستہ بھی تھا یا کوئی دوسرا راستہ بھی ہو سکتا ہے۔ مزار اہم ہے یا راستہ؟ ایک دن اس نے وائس پرنسپل سے پوچھا۔ دونوں۔ وائس پرنسپل نے ترنت جواب دیا۔ دور سے مزار پر نظر پڑتے ہی لوگوں کے دل کھلنے سے لگتے تھے، جس سے وہ اب محروم ہو گئے ہیں۔ اب انھیں وہ مزار ایک قید میں گرفتار محسوس ہوتا ہے۔ پرنسپل نے خاموشی سے یہ بات سنی۔

ایک مرتبہ وائس پرنسپل نے پراجیکٹ ڈائریکٹر کو ملنے والے گم شدہ خطوط کا ذکر بھی کیا اور اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں تھیں۔ جب ہفتہ دس دنوں بعد اس نے یہ بات دہرائی اور

اس کے چہرے پر نظریں جمائیں تو اس نے وائس پرنسپل سے پوچھا کہ وہ گم نام خطوط کس روشنائی سے لکھے ہوئے تھے؟ اس سوال پر وائس پرنسپل سٹپٹا گیا تھا اور صرف اتنا کہہ سکا کہ اس نے یہ بات پراجیکٹ ڈائریکٹر سے نہیں پوچھی تھی۔ لیکن روشنائی سے کیا فرق پڑتا ہے؟ وائس پرنسپل نے پہلو بدل کر پوچھا۔ بہت فرق پڑتا ہے۔ روشنائیوں کے مراتب سے تم واقف نہیں ہو؟ تم سبز روشنائی ہی سے دستخط کرتے ہونا! جی۔ وائس پرنسپل نے جواب دیا۔ اساتذہ کی غیر حاضری سرخ سے نشان زد کرتے ہونا! جی۔ تو فرق پڑتا ہے، بہت فرق پڑتا ہے۔ اس کے بعد وائس پرنسپل نے گم نام خطوں کا ذکر نہیں کیا، مگر اسے وہ خط موصول ہوتے رہے۔

یہ خط کبھی نیلی، کبھی سیاہ روشنائی سے لکھے ہوتے تھے۔ ہر خط کے لکھنے کا انداز جدا تھا۔ اس کے لیے یہ معلوم کرنا آسان نہیں تھا کہ ایک ہی ہاتھ اتنے مختلف طریقوں سے لکیریں، قوسیں، نقطے، شوشے بنانے کی مہارت رکھتا ہے یا ان کو لکھنے والے مختلف ہیں۔ خطوں میں نصیحت ہوتی، ڈرایا جاتا، بددعا دی جاتی، اپنے اعمال کا محاسبہ کرنے پر زور دیا جاتا اور اس جگہ کو اس کے لیے منحوس قرار دیا جاتا۔ ہمدردی اور دھمکی کا انداز ان سب میں تھا۔ خاص بات یہ بھی تھی کہ ہر خط میں لکھنے والے کا اسلوب جدا ہوتا۔ وہ ان خطوں سے اوّل پریشان ہوا تھا۔ پریشانی کی اصل وجہ یہ نہیں تھی کہ ان میں اسے ڈرایا دھمکایا جاتا تھا، بلکہ یہ تھی کہ وہ گم نام تھے۔ اس پر کھلا کہ بغیر نام کے خط اپنے لکھنے والے کو تو پوری آزادی دیتے تھے مگر اپنے مخاطب کو بے بسی کی حالت میں پہنچاتے تھے۔ اس کا رنج، ایک نامعلوم ہیولے کے گرد چکر لگاتا اور واپس اس کے دل میں ایک ٹیس بن جاتا۔ بالآخر اس نے ان خطوں کے منشا کو شکست دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے یہ عزم کیا کہ وہ واپسی کا سفر اختیار نہیں کرے گا، تاہم اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اس میں مستقبل کا اندازہ کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔ جب اسے اس منصب کی پیش کش ہوئی تھی تو اس نے اسے اپنے لیے خدائی مدد سمجھا تھا۔ شہر میں ہر وقت آوازیں، ہر وقت مصروفیت اور ہر وقت

دوسروں کی موجودگی نے اسے سخت بے زار اور کٹھور بنا دیا تھا۔ وہ ان دونوں سے نجات چاہتا تھا۔
اسی دوران میں اس نے قصباتی زندگی بسر کرنے کو اپنی قدیمی آرزو کے طور پر پہچاننا شروع کیا۔
اسے یاد ہے، جس دن اس نے پرنسپل بننے کا حکم نامہ اپنے کالج کے سپرانٹنڈنٹ سے مبارکباد کے
ساتھ وصول کیا تھا، اس نے محسوس کیا تھا کہ آدمی کی آرزوؤں کو قدرت ایک ایسے طریقے سے پورا
کرتی ہے کہ آدمی دنگ رہ جاتا ہے اور اس کا دل تشکر سے بھر جاتا ہے۔ اس نے فوراً مٹھائی منگوا
کر سب میں تقسیم کی تھی۔ فیصلے کی اس گھڑی اور بعد کے کئی ہفتوں تک اسے خیال تک نہیں آیا تھا
کہ دوسروں کے ودیعت کیے ہوئے اختیار اور آدمی کی روح میں مضمر آرزو میں ایک ازلی بیر
ہے۔ اب وہ اس سچائی کا سامنا کرنے سے نہیں ہچکچایا کہ جس وقت اس نے بہ طور پرنسپل جوائننگ
رپورٹ جمع کروائی تھی، اس وقت وہ نہ تو اپنے منصبی اختیار کی حدود کا کوئی تخیل رکھتا تھا اور نہ ہی
اپنی آرزو کی گہرائی سے واقف تھا۔ اس نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وہ ان دونوں میں کسی طرح کے تعلق
کا اس سے پہلے کوئی خیال تک نہیں رکھتا تھا۔ وہ جب اپنی گاڑی پر اس قصبے کی طرف آرہا تھا تو
اسے بس کچھ فطری مناظر اور کچھ سادہ دل لوگوں سے مسلسل ملتے رہنے کا امید افزا خیال تھا، جس
نے اس کے سفر کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ لیکن اب وہ انسان کی تقدیر کے سب المیوں کو انسان کی
مستقبل کو پہچان نہ سکنے کی صلاحیت سے جوڑ کر دیکھ رہا تھا اور افسردہ تھا اور اسی افسردگی کی حالت
میں اس سب کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا جو آئندہ دنوں میں رونما ہونے والا تھا اور جس کا
اسے قطعی اندازہ نہیں تھا۔

گم نام خطوں میں سے ایک خط نے اسے ششدر کر دیا۔ اس میں ٹھیک ٹھیک اس
خواب کو لکھا گیا تھا جسے اس نے ایک رات پہلے دیکھا تھا۔ صبح اسے پورا خواب یاد نہیں تھا۔ اتنا یاد
تھا کہ وہ ایک بڑی مشہور عمارت کے باہر کھڑا ہے اور حیران ہے کہ اس نے تو سن رکھا تھا کہ یہ
عمارت کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے مگر نہ صرف یہ جگہ جگہ سے ٹوٹی ہوئی ہے بلکہ اس کا احاطہ چند گز

سے زیادہ نہیں۔اس کے باہر وہ سیلاب دیکھتا ہے جس میں ایک ٹرین چل رہی ہے۔باقی خواب اسے بھول گیا تھا، البتہ خواب کا تاثر پوری طرح وہ محسوس کر رہا تھا جو حیرت اور قدرے ہیبت کا تھا۔خط میں اسی عمارت کے متعلق لکھا گیا تھا کہ اسے سات سو سال پہلے ایک بادشاہ نے بنایا تھا۔بادشاہ نے کہا تھا کہ وہ جب تک دنیا کی سب سے بڑی عمارت نہیں بنالیتا وہ دنیا کا بڑا بادشاہ نہیں بن سکتا۔ جو بادشاہ عمارتوں کے ذریعے اپنا تخیل واضح نہیں کرسکتا ،اسے محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کرنی چاہیے۔جب ایک دوسرے بادشاہ کو اس بادشاہ کی نیت کا علم ہوا تو اس نے کہا اب جنگ میدان میں نہیں،اس عمارت میں ہوگی۔اس نے کہا کہ اس کی ساری جنگ اس عمارت کو چھوٹی سے چھوٹی بنانے کی خاطر ہوگی۔وہ بادشاہ کو مجبور کر کے رہے گا کہ وہ عمارت بنائے ،مگر دنیا کی سب سے چھوٹی عمارت۔اس نے دریاؤں کا رخ اس جگہ کی طرف موڑ دیا جہاں پہلا بادشاہ دنیا کی سب سے بڑی عمارت بنانا چاہ رہا تھا۔چند گز جگہ اس نے خشک رہنے دی،باقی سب جگہوں پر پانی ہی پانی۔خط میں بس ٹرین کا ذکر نہیں تھا۔خط کے آخر میں لکھا تھا کہ خدا کرے تجھے اتنی ہی چھوٹی جگہ پر لمبی عمر گزارنی پڑے،جتنی چھوٹی جگہ اس بادشاہ کو دنیا کی سب سے بڑی عمارت کا خواب دیکھنے کے بعد ملی تھی۔وہ اس بددعا سے نہیں ڈرا،مگر اس بات پر سخت حیران تھا کہ خواب اور گم نام خط میں یہ تعلق کیسے قائم ہوا۔کہیں یہ خط میں نے تو نہیں لکھا؟کہیں میں نے اس شخص کا خواب تو نہیں دیکھ لیا جس نے یہ خط لکھا ہے؟یہ انوکھے واقعات شہر کے کالج میں پچیس سال تک پڑھانے کے دوران میں کیوں نہیں ہوئے؟اس نے سر جھٹکا،یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ نیند کی حالت میں نہیں۔اس نے ہزاروں مرتبہ خوابوں کے بارے میں سوچا تھا اور کچھ کتابیں بھی پڑھی تھیں۔خوابوں کی علامتوں کو اپنی شخصی زندگی سے جوڑنا اسے سب سے مشکل کام نظر آتا تھا۔آخر کار وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ جب الجھے ہوئے خواب آئیں تو اپنی جسمانی اور ذہنی صحت پر توجہ دینی چاہیے۔شاید یہاں کے کھانے مجھے راس نہیں آرہے۔اس نے ان

سوالوں سے جان چھڑانے کی خاطر سوچا جو خواب اور خط کے تعلق نے اس کے آگے رکھے تھے۔
مجھے بیوی بچوں کو کچھ دنوں کے لیے یہاں بلا لینا چاہیے۔

اس نے اس خط کو اپنے بیڈ روم میں رات کو سونے سے پہلے ایک بار پھر پڑھا، جس میں مکتوب نگار نے نام استعمال کیا تھا اور جس کے بعد اسے کوئی خط نہیں ملا۔ خط میں کئی ادھر ادھر کی باتیں تھیں۔ خط میں تین باتیں خاص تھیں۔ ایک وہی جس کا ذکر کہانی کے شروع میں آچکا ہے، دوسری خاص بات یہ لکھی گئی تھی کہ یہاں ہر صدی میں ایک بڑا سیلاب آتا رہا ہے اور یہ قصبہ اجڑتا رہا ہے۔ پچھلا سیلاب صدی کی آخری چوتھائی میں آیا تھا مگر اس صدی کا سیلاب پہلے نصف میں آئے گا جو اسی سال ختم ہو رہا ہے۔ اس کالج کی مرکزی عمارت اس جگہ تعمیر ہوئی ہے جہاں ڈھن تھی۔ یہ زمین کالج کو آسانی سے ملی بھی اس لیے تھی۔ تیسری سب سے اہم بات یہ لکھی ہوئی تھی کہ اس سیلاب کے ذمہ دار تم ہو۔ سہ پہر کو جب یہ خط ملا تھا تو وہ متفکر ہوا تھا، ڈر بھی گیا تھا اور اس کالج کو چھوڑ کر چلے جانے کا خیال بھی اس کے ذہن میں تیر گیا تھا، مگر اب آدھی رات کے وقت اپنے بیڈ پر نیم دراز خط کو ہاتھ میں پکڑے، لیمپ کی روشنی میں اس پر نظریں جمائے اسے لگا جیسے وہ کسی بڑی الجھن سے نکل آیا ہے۔ میری وجہ سے یہ کالج تباہ ہو سکتا ہے۔ او کے۔ قیصر میاں تم نے صحیح لکھا ہوگا۔ تمھارے لکھے کا سیدھا سادہ مطلب تو یہ ہے کہ فطرت کی تباہ کن طاقت میرے ایک عمل سے جوش میں، غصے میں آسکتی ہے۔ اگر وہ میرے عمل سے حرکت میں آتی ہے تو اندھی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ اندھی نہیں ہے تو صرف مجھے ہی نقصان پہنچائے گی، تم سب کو نہیں، اس کالج کو نہیں۔ لیکن ایک بات تمھارے گمان میں نہیں آئی کہ جس شخص کا کوئی عمل تباہی لا سکتا ہے، چھوٹی یا بڑی، اس کا کوئی دوسرا عمل تباہی کو روک بھی تو سکتا ہے۔

اگلے دن اس نے اپنے دوست قیصر علی انجینئر کو جلد کالج آنے کی پرزور دعوت کا خط لکھا۔

موت کاروبار ہے

ایک ہفتہ ہوگیا ہے۔سنا ہے ان تینوں کا کوئی وارث اب تک نہیں آیا۔کیا کریں گے؟ کسی ٹیچنگ ہسپتال کو بھی نہیں دے سکتے۔اس قابل ہی نہیں ہیں۔ڈاکٹر احمد نے اپنے ہم کار ڈاکٹر علی سے کہا۔

ہم نے سرد خانے،مردہ خانے،قبرستان بنائے ہیں کوئی عبرت کدہ ہی بنا دیتے۔ڈاکٹر علی نے دل لگی کی۔

آئیڈیا اچھا ہے،عبرت کدہ اسی جگہ بنانا چاہیے جہاں بم دھماکہ ہوتا ہے۔

پھر تو اس ملک کے کونے کونے میں عبرت کدے ہوں گے۔

یہی حالات رہے تو پورا ملک ہی عبرت کدہ بن جائے گا۔

وہ دن دور نہیں،جب لاشیں زیادہ اور انھیں دفنانے والے کم پڑ جائیں گے۔

ایسا وقت آیا تو لوگ لاشوں کو گدھوں کے حوالے کر کے خود نیند کی گولیاں کھایا کریں گے۔

پر سنا ہے گدھ بھی ختم ہوتے جا رہے ہیں۔

گدھ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔سارے گدھ اڑنے والے تھوڑی ہوتے ہیں(دونوں نے قہقہہ لگایا)

فارما کمپنیوں کی ہر حال میں موج ہے۔

اور ڈاکٹروں کی بھی۔(دونوں نے پھر قہقہہ لگایا)

میں نے تو اس مرتبہ کہا ہے کہ میرے لیے فیملی کے ساتھ سوئٹزرلینڈ کا ٹرپ ارینج کریں۔

وہ مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ تمھارے کلینک کے میڈیکل سٹور سے ان کے سیرپ کی صرف پانچ سو شیشیاں سیل ہوئی ہیں، حالاں کہ ہر تیسرے مریض کے نسخے میں لکھتا ہوں۔ان کا پیٹ بھی نہیں بھرتا۔

میں نے انھیں تجویز کیا ہے کہ کچھ ٹیبلٹ ایسی بھی تیار کریں جو نیوٹرل ایفیکٹ رکھتی ہوں تاکہ دونوں کا بھلا ہو۔

یہ پکس دیکھی ہیں۔کروشیا کی صدر، اللہ... کس قدر ہاٹ ہے۔

فریدہ سے زیادہ؟

وائٹ یونیفارم میں کوئی ہاٹ نظر آ سکتی ہے؟

ایک تصویر ہی بنا لینی تھی۔(دبی دبی ہنسی)

اچھا آئیڈیا ہے، پر وہ ہم سے زیادہ چالاک ہے۔پہلی شرط ہی فون آف کرنے کی رکھتی ہے۔

فون سے یاد آیا۔مشہور صحافی کی آڈیو سنی ہے جو ان دنوں وائرل ہے۔

اس کے سننے میں بھی مزا ہے۔آڈیو سیکس کا اپنا چارم ہے۔

اگر یہ نہ ہو تو ہم تو مردوں کو دیکھ دیکھ کر خود بھی مردہ ہو جائیں اور کسی مرتے ہوئے کو بچا نہ سکیں۔

دونوں ڈاکٹر وارڈ سے ملحق کمرے میں یہ باتیں کرتے ہوئے، چائے اور سنیکس لیتے ہوئے، اپنے اپنے سمارٹ فون پر مصروف تھے۔

O

تینوں لاوارث لاشوں کو امانتاً دفنا دیا جائے۔ میڈیکل سپرانٹنڈنٹ نے ضلعی انتظامیہ کے مشورے کے بعد فیصلہ کیا اور عملے کو ہدایات جاری کیں۔ جس وقت ایم ایس اجلاس ختم کر کے اپنے دفتر سے باہر نکل رہا تھا، وہ دروازے پر پہنچی۔ اپنا کارڈ آگے بڑھایا۔

کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ ایم ایس نے اس کے سراپے پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

میں ان تین لاوارث لاشوں کو دیکھنا چاہتی ہوں اور اجازت ہو تو تصویریں بھی بنانا چاہتی ہوں۔ اس نے بغیر توقف کے کہا۔

تم صحافی بھی..... کیا تم تصویریں شایع کرو گی؟ اتنی ڈراونی!!

اس کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ یہ فیصلہ کافی غور کے بعد ہوگا۔ اس نے ایم ایس کی الجھن دور کرنے کے لیے کہا۔

ٹھیک ہے۔ صرف آدھ گھنٹہ ہے۔ ہمارے پاس جگہ اور سٹاف دونوں کی کمی ہے۔ یہ کہہ کر ایم ایس آگے بڑھا پھر واپس آیا۔ پوچھا: لاوارث لاشوں سے تمھیں دل چسپی کیوں ہے؟

اس کا جواب تو میں اپنی سٹوری میں دوں گی۔ اس نے اعتماد سے کہا۔

ہمم.... او کے۔ بٹ بی کیرفل۔ دس ایریا از ناٹ سو سیف ایز یو مائٹ ہیو امیجنڈ۔ یہ کہہ کر ایم ایس چلا گیا۔

o

ایک طویل خنک کمرہ۔ روشنی کم اور موت کی خاموشی بیش از بیش۔ اعصاب پر قابو رکھنے میں اگر کوئی چیز معاون تھی تو وہ کسی نئی دریافت کا جنون تھا۔ دونوں اہلکاروں نے اسے بہت منع کیا مگر اس نے لاشوں پر سے ادھی کا کفن ہٹانے کی ضد جاری رکھی۔ اسے بار بار ایم ایس کا اجازت نامہ انھیں یاد دلانا پڑا اور ساتھ ہی اپنا پیشہ بھی!

کون کہتا ہے کہ یہ لاشیں ہیں؟ میں نے اپنے دادا کی لاش دیکھی۔ ایک سینئر کولیگ کی،

ایک پڑوسن کی اور اس کی بھی۔لاش کو دیکھنا آسان نہیں۔منہ پھاڑے گہری تاریک اندھی کھائی کو ایک پل کی چھلانگ میں عبور کرنا پڑتا ہے...وہ کھائی جو اِس اور اُس دنیا کو تقسیم کرتی ہے۔ان سب۔کے چہرے تھے،خاموش تھے،سرد تھے۔جسے آپ جھیل نہیں سکتے،اس لاتعلقی کو پہنچے ہوئے تھے۔ہمیشہ کے لیے اجنبی بن چکے تھے،لیکن شناسائی کی دل کو چیر دینے والی پرچھائیں کو لیے ہوئے تھے،اور یہی بات روح کو ریتی بن کر چھیلتی تھی۔اوران تینوں کے چہرے؟اتنی الجھی ہوئی کوئی سرریئل پینٹنگ بھی نہیں ہوتی۔کوئی بڑے سے بڑا تخلیق کار بھی اس قدر الجھاؤ اور بے رحمی کو اپنے تخیل میں لانے میں بے بس ہو جاتا ہے۔کون سی دنیا ہے جہاں بگاڑ کو اس کی انتہائی حد تک تصور کیا جاتا ہے؟اسے لگا وہ یہ سوال ان تینوں سے بہ یک وقت پوچھ رہی ہے۔اس نے اپنے سر میں شدید درد محسوس کیا اور وہاں سے بھاگ جانا چاہا۔لیکن فرض کے احساس نے اس کے قدم روک لیے۔اس نے موبائل کا کیمرہ آن کیا۔فلٹر لگایا۔کلک۔کلک۔پہلا ایک نوجوان تھا۔اس کے سینے پر ابھی بال آنا شروع ہوئے تھے۔دوسری ایک لڑکی تھی جس کی ایک چھاتی کا چوتھائی حصہ ایک ایسے انداز میں کٹا تھا کہ لگتا تھا کسی نے آنکھیں بند کر کے تیز دھار چاقو چلایا ہو۔تیسرا کوئی جوان شخص ہوگا۔اس کی سیاہ گھنی بھوں بتا رہی تھی جو کسی طرح محفوظ رہ گئی تھی۔

بی بی جلدی کرو۔باہر گاڑی آنے والی ہے۔سرد خانے کے ایک اہلکار نے اسے کہا۔

اوکے۔

وہ جیسے ہی باہر آئی۔اس نے کسی کو کہتے سنا:تم نے انھیں دیکھ تو لیا ہے،اب تم اسی ہسپتال سے اپنا علاج بھی کراتی جاؤ۔یہ نیند میں بھی تمھارا پیچھا کریں گی۔دروازے سے ذرا فاصلے پر موجود ایک بوڑھی عورت نے اس سے کہا جس نے خود اپنا تعارف کروایا کہ وہ وہاں اس خیال سے آتی ہے کہ اس کے دوسال سے گم بیٹے کی لاش شاید یہاں آئے۔اس کے ہاتھ میں بیٹے کی تصویر تھی۔

اسے فری لانس صحافت شروع کیے صرف چھ ماہ ہوئے تھے۔جس لمحے اسے اپنی پہلی سٹوری کے حوالے سے ایڈیٹر کی جوابی ای میل ملی تھی، اسی لمحے اسے الف لیلہ ولیلہ کا شہر یار یاد آیا تھا اور اس نے اسی پل فیصلہ کیا تھا کہ وہ شہر زاد کے راستے پر چلے گی۔وہ جانتی تھی کہ صحافت کی سٹوری اور شہر زاد کی کہانیوں میں بہت فرق ہے۔اس فرق کے احساس ہی نے اسے فری لانس جرنلزم کرنے کی محفوظ راہ دکھائی تھی۔جب اس کی سٹوری ایک اخبار سے واپس آتی تو اسے افسوس تو ہوتا مگر وہ دل برداشتہ نہ ہوتی۔ وہ ان سٹوریز کو ایک الگ فورلڈر میں محفوظ کرتی جاتی۔اس کے ذہن میں ایک اپنی ویب سائٹ کا خیال بھی تھا، جہاں وہ یہ سب شایع کر سکے گی، مگر ابھی وہ مین سٹریم اخبارات میں کام چاہتی تھی۔اس کی اس خواہش کا تعلق بھی شہر زاد کے کردار سے تھا جو شہر یار کے بغیر نامکمل ہے۔یہ سٹوری تیار کرتے ہوئے بھی اسے یقین نہیں تھا کہ وہ کسی اخبار میں چھپے گی یا نہیں۔ خیر کوئی بات نہیں۔اس نے خود کو تسلی دی۔زیادہ سے زیادہ یہ بھی اسی فولڈر میں چلی جائے گی۔

آپ کو کیسے یقین ہے کہ آپ کے بیٹے کی لاش ہی یہاں آئے گی؟ اس نے اس بوڑھی عورت کو چائے کا کپ پیش کرتے ہوئے کہا، جسے وہ ہسپتال کی کینٹین پر لائی تھی۔

وہ کسی کو زندہ نہیں چھوڑتے۔سب کی لاشیں ہی ملی ہیں۔اس کی آنکھوں میں خشک آنسو تھے۔

کیا اسی ہسپتال میں؟

نہیں۔میں ہسپتال میں کبھی کبھی آتی ہوں۔آس پاس کے علاقوں میں بھی جاتی ہوں۔ کچھ کی لاشیں ہمارے گاؤں کے تالاب سے بھی ملی ہیں اور کچھ کی پہاڑوں میں جہاں میں مشکل

سے پہنچ سکتی ہوں۔

تمھارے بیٹے کی عمر کیا تھی؟

بائیس سال۔

اسے بندوق چلانا آتی تھی۔

آتی تھی۔ میں اسے منع کرتی تھی کہ وہ کسی سے نہ ملا کرے، مگر نوجوان تھا، گھر میں ٹکتا نہیں تھا۔

آپ کو یقین ہے کہ اسے وہی لے گئے ہیں؟

اور کون لے جا سکتا ہے؟ میرے پاس اس کی صرف ایک تصویر ہے۔ وہ تصویر بنواتا ہی نہیں تھا۔

اگر اس کی لاش بھی اسی طرح کی ہوئی تو کیسے پہچانیں گی؟ اس نے موبائل کی گیلری میں تصویریں دیکھتے ہوئے کہا۔

میں اسے ہاتھ، پاؤں، سینے سب جگہوں سے پہچانتی ہوں۔ اس کی بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی میں ایک زخم کا نشان ہے جو اسے لکڑیاں کاٹتے ہوئے لگا تھا۔ اس کے سینے پر ایک بڑا سا کالا داغ ہے۔ ایسا ہی داغ اس کے ابا کی کمر پر تھا۔ اس کے دائیں پاؤں کے ٹخنے پر بھی زخم کا نشان ہے جو اسے بچپن میں لگا تھا جہاں اسے ایک کتے نے کاٹا تھا۔

اسی دوران میں اسے اپنی سٹوری کا ابتدائیہ سوجھا۔ اس نے موبائل ریکارڈنگ آن کی۔ اس نے دیکھا کہ سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا ایک شخص اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کی نظر ایک مرد کی پرشوق نظر نہیں تھی۔

اماں ایک سوال پوچھوں۔ ذرا اور طرح کا ہے۔ برا نہ مانیے گا۔

پوچھیں۔ بوڑھی عورت نے چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

جب آپ نے ان لاشوں کو دیکھا تو کیا محسوس کیا۔ میرا مطلب ہے۔ خوشی.....نہیں نہیں .....اطمینان......مطلب کہ یہ آپ کے بیٹے کی نہیں... یہ جان کر اطمینان ہوا ہوگا؟ اسے اپنا سوال ترتیب دینے میں دقت محسوس ہوئی۔

لاش کو دیکھ کر دا، دکھی ہوتا ہے، کسی کی بھی ہو۔ اطمینان.....میری زندگی میں کہاں؟ بوڑھی عورت بولی۔

جن لاشوں کا کوئی وارث نہ ہو۔ انھیں دیکھنا.....اور جن کے بیٹے گم ہو گئے ہوں، ان کی لاشوں کی امید.....یہ سب بھیانک ہے، حد درجہ بھیانک۔ اماں۔ تم نے اب تک کتنی لاشیں دیکھی ہیں؟ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے اپنی بات اماں کو سمجھائے۔

میں تو گنتی بھی بھول گئی ہوں۔ اتنی لاشیں دیکھی ہیں کہ .....خود بھی لاش بن گئی ہوں۔ میں زندہ تھوڑی ہوں.......

ایک بوڑھی ماں ہے جس کی یادداشت سے سب مٹ چکا ہے، سوائے اس کے نوجوان بیٹے کی لاش کے۔ ہمیں جس دنیا کی خبریں ایک صبح سے لے کر اگلی صبح تک ملتی ہیں، اس میں کچھ بہ ظاہر غیر اہم مگر حقیقت میں بڑی باتیں جگہ ہی نہیں پا سکتیں۔ اسی وطن کے ایک حصے میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں ایک کچے گھر میں رہنے والی ماں کی واحد امید یہ ہے کہ ایک دن وہ اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھ سکے گی۔ یہ حقیقت کبھی خبر نہیں بن سکتی کہ اسی دنیا کی ایک جیتی جاگتی عورت ایک لاش کی امید کے سہارے زندہ ہے۔ جس دنیا میں جینے کی امید لاش ہو، وہ دنیا جینے کے قابل کہلانے کا حق رکھتی ہے؟ اس مرتبہ جو دھماکہ ہوا اس میں ایک سو پچاس لوگ مارے گئے۔ صرف دو کے نام ٹی وی اور اخبارات میں آئے۔ بار بار آئے۔ باقی سب شمار میں آئے۔ صرف دو بڑے آدمیوں کا ماتم ہوا۔ تعزیت کی گئی۔ شمار میں آنے والے......

بیٹی کچھ پریشانی ہے۔ بوڑھی عورت نے اسے چپ دیکھ کر پوچھا۔ وہ کافی دیر سے اپنی

سٹوری کوسوچے جارہی تھی۔

نہیں اماں.....میں سوچ رہی تھی.....سوچ رہی تھی کہ آپ بہت بہادر ہیں۔

بہادر بننا پڑتا ہے۔ میرا خاوند اس وقت مرگیا تھا جب بیٹا دس سال کا تھا۔ کچھ اس کی پنشن ہے، باقی میں نے کچھ بھیڑ بکریاں رکھی ہوئی ہیں۔ بیٹی کی شادی میں نے خود کی تھی۔ شکر ہے وہ شہر میں ہے۔اس کا خاوند فوج میں ہے۔اماں بتانے لگی۔

جس بم دھماکے میں کوئی بڑا آدمی مارا جائے، اس میں باقی مرنے والوں سے زیادہ بد قسمت کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بدستور اپنی سٹوری کوسوچے جارہی تھی۔ اچانک اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔مجھ میں اورالف لیلہ کے شہر یار میں فرق ہی کیا ہے؟ میرے سامنے ایک بوڑھی ماں بیٹھی ہے اور میں یہ سوچ رہی ہوں کہ کیسے ایک ایسی سٹوری لکھوں جسے کوئی بھی اخبار فخر سے چھاپے۔

اماں اپنے بارے میں اور بتایئے۔

میری ایک بہن تھی۔اس کی بیٹی سے بیٹے کی شادی کرنا چاہتی تھی۔ پرغیاث (اماں نے پہلی بار بیٹے کا نام لیا) کہتا وہ ماموں کی بیٹی سے شادی کرے گا۔ وہ مذاق کرتا تھا۔اس نے شادی وہیں کرنی تھی جہاں میں کہتی۔ میرا بھائی بزدل ہے۔وہ میرے ساتھ کہیں نہیں آتا۔ ڈرتا ہے کہ کہیں اسے بھی پکڑ کر نہ لے جائیں۔ وہ مجھ سے پانچ سال چھوٹا ہے۔ میں اسے کہتی ہوں صرف جوان پکڑے جاتے ہیں۔ پھر بھی ڈرتا ہے۔ وہ اخبار بہت پڑھتا ہے۔ادھرادھرآتا جاتا بھی ہے۔اس کی بیٹی کو دیکھتی ہوں تو سوچتی ہوں غیاث ٹھیک ہی کہتا تھا۔ وہ میری بھانجی سے زیادہ اچھی شکل کی ہے۔ کچھ کچھ تیری طرح۔ تیرے بال سنہری ہیں،لیکن اس کے کالے ہیں۔

اماں کو اپنے خاندان کے بارے میں بات کرتے ہوئے عجب خوشی محسوس ہورہی تھی۔

ہونہہ.....اماں تو کب تک اپنے بیٹے کی.....میرا مطلب ہے بیٹے کا انتظار کرے گی؟

اسے کوئی اور سوال نہیں سوجھا۔

الف لیلہ کے شہر یار کو ہر رات ایک لڑکی چاہیے تھی، لیکن ہمارے زمانے کے شہر یار کو ہر پل ایک نئی، چونکا دینے والی، دوسروں پر اس کی سبقت کو ظاہر کرنے والی خبر چاہیے۔ نتیجہ؟ مسلسل فراموشی۔ اس نے یہ لائن خاصی محنت سے اپنی سٹوری کے شروع میں لکھی، پھر یہ سوچ کر مٹا دی کہ اسے تو پس منظر میں رہنا چاہیے۔ پھر یہ سوچ کر مسکرا دی کہ وہ شاید خود کو یاد دلانا چاہتی تھی۔ اپنی ہی فراموشی کے خلاف یہ ایک لاشعوری جدوجہد تھی!

یہ تین لاشیں.....جو اس قدر مسخ شدہ ہیں کہ لاش کے طور پر بھی اپنی شناخت کھو چکی ہیں، اور جنھیں اب تک مٹی میں دبایا جا چکا ہوگا اور ہسپتال میں موجود لوگ بھی فراموش کر چکے ہوں گے ....ہماری مسلسل فراموشی کی منھ چڑاتی علامت ہیں۔ (منھ چڑاتی ٹھیک نہیں۔ کوئی اور مناسب لفظ ہونا چاہیے۔ وہ رک کر سوچنے لگی)۔ ہماری مسلسل فراموشی کی ناقابل فراموش علامت ہیں۔ میں نے انھیں اتنے قریب سے دیکھا۔ اتنے قریب سے.....اور غور سے کہ وہ میری یادداشت کا مستقل حصہ بن جائیں۔ میں اعتراف کرتی ہوں کہ اس کے لیے مجھے موت کے ڈر سے زیادہ، ان لاشوں سے پیدا ہونے والی ہیبت پر قابو پانا پڑا۔ یہ آسان نہیں تھا۔ مجھ پر پہلی بار انکشاف ہوا کہ ایک جیتے جاگتے آدمی کے ڈر پر قابو آسان ہے، حالاں کہ وہ ہمیں موت سے بھی ہم کنار کر سکتا ہے، لیکن ایک مسخ شدہ لاش جو ہمیں حقیقت میں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی، اس کی ہیبت پر قابو پانا آسان نہیں۔

پہلے یہ تینوں لاشیں اس گنتی کا حصہ تھیں جو روز اخبارات میں شایع ہو رہی تھی۔ جس وقت دھماکا ہوا، اس وقت گنتی ستر تھی۔ آدھ گھنٹے بعد اسی ہوئی۔ پھر بڑھتی بڑھتی ایک سو پچاس تک پہنچ گئی۔ یہ گنتی محض اپنے بڑھنے کے سبب پڑھنے اور سننے والوں کے لیے ہلکے سے افسوس کا

باعث تھی۔شاید ہی کوئی ہو،جس نے یہ سننے یا پڑھنے کے بعد کہ مرنے والوں کی تعداد ایک سو پچاس تھی، اپنے سینے میں کوئی شے اٹکتی محسوس کی ہو یا ٹھنڈی سانس ہی بھری ہو؛ ٹی وی کی سکرین پر نظریں جمائے، کھانے سے ہاتھ روک لیا ہو یا کچھ دیر کے لیے اپنا فون بند کر کے ایک طرف رکھ دیا ہو۔کیا ہم سنگ دل ہو گئے ہیں؟....اس نے جیسے خود سے پوچھا،اور پھر خود ہی جواب دیا: آدمی سنگ دل تو ہے۔لیکن بڑا مسئلہ یہ گنتی ہے۔آدمی ہو کہ آدمی کی لاش، گنتی میں آتے ہی باقی نہیں رہتے۔گنتی وجود کو تحلیل کر دیتی ہے اور اس کی جگہ ایک نا قابل محسوس اشارے کو دے دیتی ہے۔گنتی کا افسوس،اس دکھ کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے جو ہمیں شاہد،عمر بیس سال، والدین کا اکلوتا بیٹا،خوش شکل،ایک ہفتے بعد شادی ہونے والی تھی...سن کر ہوتا ہے۔پھر یہ لاشیں ....مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ان کے لیے کوئی دوسرا لفظ نہیں....مسخ شدہ مرا ہوا آدمی....لاش کے سوا ہوتا ہے...یہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آئی ہوں....اس بڑی گنتی سے بھی نکل گئیں۔ایک سطر کی ایک پل کی خبر رہ گئی۔فراموشی کا گہرا غار انھیں نگل گیا۔کسی کو ان کا نام نہیں معلوم۔کون، کہاں کے تھے یہ لوگ... کسی کو خبر نہیں۔کوئی ان کی تلاش میں نہیں آیا۔کسی نے ان کے ماضی کی تلاش نہیں کی۔کس کے پاس فرصت، کسے ان سے دل چسپی....لیکن ہم ان کے بارے میں کچھ بھی نہ جانتے ہوں، یہ ہمیں کچھ بتاتی ہیں۔جی ہاں۔لاشیں بھی بتاتی ہیں۔لاش کہانیاں بھی سناتی ہے،زندگی کی سب سے بڑی سچائیوں کی کہانیاں۔(اسے بیتال پچیسی یاد آئی)۔یہ تین لاشیں بتاتی ہیں کہ ہم میں موت کے بھیانک پن کی یاد سے جان چھڑانے کی مستقل عادت ہے۔اور اسی بنا پر ہم روز موت کے بھیانک پن کا سامنا کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک جیتا جاگتا آدمی، کسی دوسرے آدمی کی ذمہ داری ہوسکتا ہے،مگر ایک لاش ان سب پر اپنی ذمہ داری کا بوجھ ڈالتی ہے جو زندہ ہیں اور جو زندہ ہیں وہ اپنے کندھوں سے اسے جلد سے جلد اتار پھینکنا چاہتے ہیں،اپنے ذہن اور دل سے بھی۔یہ بات زیادہ خوفناک ہے۔سب آگے بڑھنا

چاہتے ہیں، اور یہی بات آگے بڑھنے کی راہ میں دیوار بن جاتی ہے۔ ان لاشوں کو بھولنے والے، اگلے دن پھر اور لاشیں دیکھتے ہیں، پھر انھیں بھی بھلا دیتے ہیں، پھر اور دیکھتے ہیں، مگر بھولنے کی عادت ایسی ہے جسے وہ کبھی نہیں بھلاتے۔ اگر ہم ٹھیک طرح سے ایک ہی لاش کو دفنانے کی واقعی کوشش کرلیں تو سب لوگ طبیعی موت مریں۔ (اس نے پہلے لکھا کہ ٹھیک طرح سے دفنانے کا مطلب، ایک لاش کی توقیر ہے جو اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ اس کے جینے کے حق پر شب خون مارنے والوں کا کڑا احتساب ہو۔ لیکن بعد اس نے یہ جملہ حذف کردیا) ہم میں سے کوئی نہ کوئی تو ہے جو نہیں چاہتا کہ لوگ طبیعی موت مریں۔ موت ایک بزنس ہے۔ لاشیں اس بزنس کا سکہ ہیں۔ جس دھماکے میں یہ تین بے نام لوگ بھی مارے گئے، اس سے کتنوں کو فائدہ ہوا، یہ جاننے کے لیے بس یہ دیکھیے کہ کس کو کس مد میں کتنے فنڈز جاری ہوئے، کہاں سے کس کو امداد ملی، کس کی دکان پر رش بڑھا۔ کن لوگوں نے افسوس کے وقت تصویریں بنوائیں اور ٹکر چلوائے۔ جب یہ بزنس ہو چکا تو یہ تین لاشیں ......تین بے نام، بے چہرہ لوگ ....کھوٹے سکے بن گئے۔ بے کار۔ بوجھ۔ ان کی قبر پر کوئی تختی ہوگی، نہ کوئی فاتحہ۔

اسی دوران اس کے موبائل پر بیپ ہوئی۔ رات کے ایک بجے کس کا میسج ہے۔ پرومو ہوگا۔ پھر بھی اسے تجسس ہوا۔ کھولا تو نمبر اجنبی تھا۔ رومن اردو میں لکھا تھا۔ لاوارث لاشوں کی تفتیش میں زیادہ جرأت نہیں دکھانا، ورنہ خود بھی جلد ....میرا مطلب سمجھ گئی ہوں گی۔ یہ کون ہے اور اسے کیسے معلوم ہوا؟ اس نے یاد کیا اس نے سوائے اپنی امی کے کسی کو نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جارہی ہے۔ ذہن پر زور ڈالا تو یاد آیا۔ ایم ایس کو کارڈ دیا تھا۔ اس کی صحافیانہ حس نے فوراً اس کے انگریزی جملے کا ٹھیک مطلب اب سمجھا اور اس نوجوان کی نظروں کے معنی کو بھی جو اسے کینٹین پر دیکھے جارہا تھا۔ پہلے خاموش رہنے کا سوچا، پھر ازرہ تجسس اسے جواب لکھا۔

اپنا تعارف تو آپ نے کرا ہی دیا ہے۔ ذرا یہ بھی بتانے کی زحمت کیجیے کہ وہ سرحد پار

سے آئے تھے یا.....؟

لگتا ہے تمھارا ارادہ پکا ہے، لاوارث لاش بننے کا۔

او کے۔آئی ایم سوسوری۔ریسٹ اشورڈ۔ول ڈو بیسٹ ٹو بی کیرفل۔گاڈ بلیس یو۔اس نے جیسے حفاظتی جیکٹ پہن لی۔

بی بی۔پہلی بات: سٹوری کرنا آپ کے بس کا روگ نہیں۔بہتر ہے آپ رسالوں کے لیے کہانیاں لکھا کریں۔دوسری بات: تمھاری سٹوری کا آخری حصہ اگرچہ کل کی لیڈ بن سکتا ہے، مگر ہمیں اپنا اخبار اور جان دونوں عزیز ہیں۔ایڈیٹر کا جواب کچھ زیادہ توقع کے خلاف نہیں تھا۔

اس نے چپ چاپ یہ سٹوری اس فولڈر میں منتقل کر دی، جسے اس جیسی کہانیوں کے لیے اس نے بنا رکھا تھا۔لیپ ٹاپ بند کرتے ہوئے اسے خیال آیا کہیں یہ فولڈر بھی فراموشی کا غار نہ ثابت ہو!

یہ خدا کہاں نہیں رہتے؟

اسے اتنا تو یاد تھا کہ وہ کس وقت یہاں پہنچا تھا، مگر کب، یہ بھول چکا تھا۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اپنے آنے کو یاد رکھنے اور دن اور تاریخ کو بھول جانے میں کس بات کا دخل تھا۔ شاید اس کی ماضی قریب کی یادداشت کا کمزور ہو جانا۔ شاید اس کا کوئی لاشعوری دفاعی عمل۔ یا شاید واقعات کے رونما ہونے کا وہ سلسلہ جس سے اسے اچانک گزرنا پڑا اور جس نے اسے اپنے آس پاس ایک مہیب دنیا کے موجود ہونے کا احساس دلایا، جس کے بارے میں وہ کبھی کبھی سنا کرتا تھا۔ البتہ اس بات پر وہ کسی کسی وقت حیران ہوتا تھا کہ اسے کیسے یہاں آنے کا وقت اب تک یاد تھا، شاید ایک کھڑکی اس دنیا میں کھلی تھی جس سے وہ کٹ گیا تھا۔ جس وقت اسے اس کمرے میں دھکیلا گیا تھا اور اس سے ذرا ہی پہلے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹا دی گئی تھی، ٹھیک اسی وقت اس نے مغربی افق پر سنہری ٹکیہ دیکھی تھی۔ اتنے عرصے بعد سورج کو غروب ہوتے دیکھنا اس کے لیے ایک اچانک، غیر متوقع نعمت ملنے کے مترادف تھا اور اس لمحے وہ بھول گیا تھا کہ اسے وہاں لانے والے کتنے آدمی تھے۔ اندر کمرے میں جب اسے دھکا دیا گیا تھا اور وہ سنبھل گیا تھا تو دو خیال آگے پیچھے تیزی سے آئے تھے۔ وہ کتنے لوگ تھے؟ دو، تین یا چار۔ ایک اور پانچ تو بالکل نہیں تھے۔ یہ اسے یقین تھا۔ اسے کمرے کے اندر ایک شخص نے دھکا دیا تھا یا سب نے مل کر؟ دروازہ پہلے سے کھلا تھا یا ان میں سے کسی نے اس وقت کھولا تھا، جب اس کی نگاہ سنہری ٹکیہ

میں گڑی تھی۔ یہ دونوں خیال اسے کافی پریشان کرتے رہے۔ اسے نہیں معلوم کتنے پہروں یا دنوں بعد اس پر کھلا کہ کمرے میں آنے کے بعد کمرے سے نکلنے کا واحد ذریعہ اسے یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ ان کے بارے میں سوچے جو اسے یہاں چھوڑ گئے تھے۔ اسی طرح اسے یہ کبھی معلوم نہ ہوسکا کہ کتنے پہروں یا دنوں بعد اسے خیال آیا کہ کمرے میں ہر وقت روشنی اور تاریکی کا تناسب یکساں رہتا ہے، سوائے اس وقت کے جب بارش ہوتی۔ جس وقت اسے دروازے سے دھکا دیا گیا تھا اور وہ فرش پر گرتے گرتے بچا تھا تو اس نے سوچا تھا کہ اسے یہاں رات (راتیں) گزارنی ہوگی۔ مگر یہاں نہ رات آئی نہ دن ہوا۔ اسے مسلسل تلاش رہی کہ وہ جان سکے کہ یہاں وقت کو کیسے ٹھہرالیا گیا ہے، مگر اس کی تلاش بے سود رہی۔ جنھوں نے اسے یہاں لا پھینکا تھا، وہ کچھ بھی ممکن بنا سکتے ہیں۔ یہ خیال اس کی تلاش کے بے سود ہونے کا اصل سبب تھا، جو اس پر نہ کھل سکا۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اس نے کمرے کی کل کائنات کو دیکھ لیا تھا۔ پتھر کی اینٹوں کا بنا ہوا فرش، دو طرف سے روشن دان۔ دیواریں سرمئی پتھروں سے چنی ہوئی تھیں۔ روشن دان اس کی رسائی سے دور تھے۔ لکڑی کا بھاری دروازہ تھا جسے باہر سے تالا لگانے کی آواز اس نے سنی تھی۔ یہ آواز اسے اس وقت بھی سنائی دیتی تھی، جب روشن دان میں کسی وقت کوئی بھورے رنگ کی چڑیا آن بیٹھتی تھی یا پہاڑی کوا اس کے سامنے سے گزرتا تھا اور اس کے پروں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کبھی کبھی بادلوں کے گرجنے اور بارش کے ہونے کی آواز کمرے میں دراتی محسوس ہوتی تھی، مگر اس نے بارش کو برستے نہیں دیکھا تھا۔ جب بارش برستی تھی تو کمرے میں روشنی کچھ کم ہوجاتی تھی، مکمل اندھیرا تب بھی نہیں ہوتا تھا۔ روشن دان سے کھانا لٹکانے کی بھی ہلکی سی آواز آتی تھی۔ یا پھر کمرے کے دروازے کے دائیں جانب بنے بیت الخلا سے پانی کی آواز آتی تھی، جب وہ خود وہاں جاتا تھا۔

اسے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟ وہ یہ سوال اس وقت سے سوچ رہا تھا، جس وقت وہ اسے یہاں بند کر کے گئے تھے، اور جب اس نے یہاں ایک عجب طرح کی باس محسوس کی تھی۔ بند کمرے

کی اپنی، سیلن زدہ باس۔ مگر پھر اسے معلوم ہوا کہ یہ سوال اس مستقبل سے متعلق ہے، جس پر اس کا سرے سے اختیار ہی نہیں، نیز یہ سچائی کے پھندے میں پھڑ پھڑانے کی کوشش سے زیادہ نہیں جو اس کی تقدیر بنا دی گئی ہے تو اس نے اسے سوچنا ترک کر دیا۔ لیکن سچائی کے پھندے میں اس کی پھڑ پھڑاہٹ یکسر ختم نہ ہو سکی۔ دوسروں کی مسلط کی گئی سچائیوں سے نباہ میں جتنی مشکلیں پیش آ سکتی ہیں، اسے ان سے گزرنے کے سوا چارہ محسوس نہیں ہوا۔ رو کر یا ہنس کر۔ اس نے خود سے کہا۔

وہ سونے کی کوشش کرتا۔ حالاں کہ اسے نیند محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پہلے کمرے میں کئی چکر لگاتا۔ اپنے قدم گنتا۔ ایک ہزار قدم جب پورے ہوتے تو اس دیوار کے پاس بیٹھ جاتا، جس کے سامنے روشن دان نہیں تھا۔ آنکھیں بند کرتا۔ اپنے ہی سانسوں کی آواز سے جلد ہی کھول دیتا جو کسی حد تک کمرے کی باس کے عادی ہونے لگے تھے۔ سانسوں پر دھیان دیتا تو وہ بے ترتیب ہو جاتے۔ اٹھ کھڑا ہوتا۔ دیوار سے ٹیک لگا کے آنکھیں بند کر لیتا۔ اب اسے لگتا کہ اس نے ایک پاؤں پر زیادہ زور ڈالا ہوا ہے۔ دونوں پاؤں پر یکساں زور ڈالنے کی سعی کرتا تو اسے لگتا کہ اس کے پاؤں کمزور ہو گئے ہیں، حیران ہوتا کہ اتنے بھاری وجود کو انھوں نے کیسے اتنے عرصے سے سنبھالا ہوا ہے۔

سونے کی کوشش سے زیادہ لغو کوئی چیز نہیں۔ ایک دن اس نے خود سے کہا۔ اس کے بعد سونے کی کوشش ترک کر دی۔ کسی وقت بیٹھے بیٹھے یا چلتے ہوئے اس پر اچانک غنودگی طاری ہوتی تو مزاحمت نہ کرتا۔ لیکن یہ لحہ بھر کا کھیل ہوتا۔ اس کا اندازہ بھی اسے ایک دن اس وقت ہوا، جب اس نے غنودگی کے حملے سے پہلے روشن دان میں ایک نئے پرندے کو دیکھا تھا، جو اس کے جاگنے کے بعد بھی وہاں موجود تھا۔

مجھے دنیا کی سب سے کڑی سزا کا سامنا ہے۔ اس نے خود کو بتایا۔ میں اس جگہ ہوں

، جہاں وقت روک دیا گیا ہے۔ کیا میں موت سے آزاد ہو گیا ہوں؟ اس نے خود ہی سے سوال کیا۔ موت سے آزادی دوسری کڑی سزا ہے۔ خود ہی جواب دیا۔ اس نے اس خواہش کا غلبہ محسوس کیا کہ وہ دنیا کی سب سے کڑی سزا کو پوری طرح محسوس کرے اور جھیلے۔ اس کے بغیر اسے یقین کرنا مشکل لگا کہ وہ زندہ ہے۔ اس نے دیوار پر زور سے مکا مارنے کا فیصلہ کیا مگر جب دیوار پر اس کی دایاں بند مٹھی کا نچلا حصہ لگا تو اسے معمولی تکلیف محسوس ہوئی۔ میں کافی کمزور ہو گیا ہوں۔ اس نے اعتراف کیا۔ کمزور آدمی موت سے کیسے آزاد ہو سکتا ہے، وہ تو موت کی طرف بڑھ رہا ہوتا ہے۔ جو موت کی طرف بڑھتا ہے، وہ وقت سے باہر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس نے محسوس کیا کہ اس طرح کے سوالات پر سوچنے کی نہ تو اسے عادت ہے نہ ہمت۔ لیکن یہ رکا ہوا وقت؟ یہ مجھے مار ڈالے گا۔

وہ کتنے لوگ تھے؟ اس نے طے کیا کہ وہ ان کا پیچھا کرے گا۔ جب اس نے کمرے کے باہر سے بند ہونے کی آواز سننے پر پیچھے دیکھا تھا تو اسے ہیولے دکھائی دیے تھے۔ ایک آدمی تو وہ بہ ہر حال نہیں تھا۔ دو تھے؟ ایک تو گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی نگرانی ایک آدمی تو نہیں کر سکتا تھا۔ لہٰذا وہ دو سے زیادہ تھے۔ تین تھے؟ شاید۔ اس وقت وہ اپنے فلیٹ کے قریب پہنچا ہی تھا کہ اسے پکڑ کر گاڑی میں ڈال دیا گیا تھا اور فوراً اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی تھی۔ اس کی کلائی سے گھڑی اتار لی گئی اور جیب سے سیل فون، ویلٹ، کچھ پرچیاں اور ایک پنسل سب نکال لیا گیا۔ ایک آدمی نے اس کا نام پوچھا تھا۔ اچھا تو تم ہو۔ یہ اس آدمی نے کہا تھا، جو اس سے پہلے گاڑی میں بیٹھا تھا اور جسے اس نے آنکھوں پر پٹی بندھتے وقت دیکھا تھا۔ میرا قصور؟ ہم صرف حکم کی پابندی کرتے ہیں۔ کسی کے حکم کی پابندی تو میں بھی کرتا ہوں۔ اس نے اپنے دفاع میں کہا تھا۔ لیکن تم اس کے حکم کو نہیں مانتے، جس کے حکم پر ہم چلتے ہیں، یہ شہر چلتا ہے، یہ ملک چلتا ہے، یہ دنیا چلتی ہے۔ کس کے حکم پر؟ اس کے جواب میں اسے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا۔ دیکھو،

میں نے اصرار نہیں کیا۔ تمھارا حکم مان لیا، اتنی دیر چپ رہا۔ اب تو بتا دو کہ میرا قصور کیا ہے؟ اس بار اسے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔ گاڑی کسی پہاڑی راستے پر چل رہی تھی، ہچکولے کھا رہی تھی۔

وہ کہاں سے آئے تھے؟ اسے لگا جیسے اس سوال نے اسے کسی ممنوعہ علاقے میں لا پٹخا ہے۔ وہ ڈر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس پر ڈر کا سبب کھلنے لگا۔ وہ علاقہ محض اس لیے ممنوعہ نہیں کہ وہاں کے راستے عام لوگوں کے لیے بند ہیں اور جہاں پہنچنے کی کوشش کسی مہیب خطرے کا شکار کر سکتی ہے، بلکہ اس لیے بھی کہ اسے ٹھیک ٹھیک پہچاننا مشکل ہے۔ وہ کہیں بھی، کسی بھی شکل میں ہو سکتا ہے۔ اس کے محیط میں سب جگہیں ہیں؛ وہ سب جگہیں جن کا خیال انسانی ذہن کو آ سکتا ہے اور جنھیں ٹھیک ٹھیک پہچاننے کی کوشش میں انسانی ذہن بری طرح بھٹک سکتا ہے اور دائمی سزا کا مستحق سمجھا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنے آس پاس دیکھا۔ چھت کو دیکھا۔ کئی جگھوں سے سیمنٹ اکھڑا ہوا تھا۔ اس کے ٹکڑے کسی وقت گر سکتے ہیں، مجھے احتیاط کرنا ہوگی۔ چھت کے درمیان میں ایک موٹا، بڑا محدب شیشہ تھا جس کے بارے میں اسے تجسس نہیں ہوا۔ اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ جینز نہ ہوتی تو ایک نئی مصیبت ہوتی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے سمجھ نہیں آئی کہ وہ ان پر ترس کھائے یا ان کا مذاق اڑائے جو سب جگھوں پہ ہیں بھی اور نہیں بھی۔ خدا بننے کی اداکاری انھیں بندوں کے لیے تباہ کن ضرور بنا دیتی ہے، مگر خود وہ آدمی کی زندگی جی سکتے ہیں؟ خدا کی مانند ہو سکتے ہیں؟ انھوں نے میری آنکھیں بند ہی اس لیے کی تھیں کہ میں مسلسل انھیں اسی طرح محسوس کروں جیسے خدا کو ہر وقت، ہر جگہ، آس پاس، اندر باہر خیال کیا جاتا ہے۔ آہ! خدا بننے کے لیے کمزوروں کی آنکھیں بند کرنا ضروری ہے۔ اس نے ان لمحوں کو یاد کیا۔ اسے کسی کسی وقت، اپنے گاؤں میں مقیم والدین یاد آئے تھے، اور اپنے دفتر کے لوگ بھی، لیکن زیادہ وقت وہ ان کو پہچاننے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ انھوں نے آپس میں کچھ باتیں کی تھیں، جنھیں وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ کچھ نمبر اور کچھ انگریزی لفظ بول رہے تھے، جو اس نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اس نے

اندازہ لگایا تھا کہ وہ اس جگہ کا ذکر کر رہے ہوں گے جہاں اسے لے جایا جا رہا تھا۔ واہ، خداؤں کی زبان بھی اپنی ہوتی ہے۔ جب بھی کوئی خدا بنتا ہے تو سب سے پہلے اس کی زبان بدلتی ہے۔ وہ کم بولتا ہے اور اپنی ایجاد کردہ زبان میں۔ اسے لگا کہ وہ ممنوعہ علاقے کے اس مرکز پر پہنچ گیا ہے جہاں خدا رہتے ہیں۔ وہ دل میں مسکرایا، اس عظیم دریافت اور رسائی پر۔ سب خدا اپنی جگہ، صورت، تیور کے ساتھ ساتھ زبان بھی اپنی ایجاد کرتے ہیں تا کہ انھیں کوئی ٹھیک پہچان نہ سکے، تا کہ کوئی انھیں پوری طرح سمجھ نہ سکے، تا کہ وہ سب کچھ کرنے کا اختیار حاصل کر سکیں جو وہ چاہیں، تا کہ وہ سب چاہیں جسے اب تک چاہا نہیں گیا، تا کہ وہ دوسروں سے بات نہ کریں، صرف حکم دیں، تا کہ سب ان کے احکام پہچاننے کی آرزو میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں اور اسے سعادت سمجھیں، تا کہ جب ان کے احکام نہ پہچانے جائیں یا پہچانے جانے کے بعد نہ مانیں جائیں تو سب کی روحیں فنا کر دیں۔

اگر وہ کہیں بھی ہو سکتے ہیں تو یہ بھی ہو سکتا ہے وہ اسی جگہ سے آئے ہوں جہاں میں کام کرتا ہوں۔ اس نے اپنے رفقا کو یاد کیا۔ ان کے ساتھ ہونے والی باتوں کو یاد کیا۔ لیکن.....وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ اس نے خود کو انکار کی حالت میں گرفتار محسوس کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح ہر شخص کسی سے محبت کر سکتا ہے، جس طرح ہر شخص کسی کی جان لے سکتا ہے، جس طرح ہر شخص کسی کے لیے، کسی بھی وقت جان دے سکتا ہے، اسی طرح ہر شخص کسی کو دھوکا بھی دے سکتا ہے، عمر بھر کے دھوکے سے لے کر وقتی دھوکے تک۔ ہاں یہی سچ ہے، وہ انکار کی حالت سے باہر نکلا۔

پر میں نے کون سا حکم نہیں مانا؟ اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اخبار کے مالک کا کوئی حکم اسے کبھی نہیں ملا تھا۔ آج پہلی مرتبہ اسے حیرت ہوئی کہ سات سالوں میں اس کی اخبار کے مالک سے ملاقات تک نہیں ہوئی۔ اس پر البتہ حیرت نہیں ہوئی کہ کبھی اس نے مالک سے ملنے کی خواہش بھی نہیں کی۔ اس کا کام بھی صرف اخبار کو ملنے والے مضامین کی زبان ٹھیک کرنا تھا۔ ان

کی اشاعت کا فیصلہ ایڈیٹر کرتا تھا جس سے اس کی ملاقات روزانہ ہوا کرتی تھی۔ کئی مرتبہ اس نے ایڈیٹر سے کہا کہ یہ کالم یا مضمون معمولی ہے، مگر ایڈیٹر کے کہنے پر اسے اشاعت کے لیے دے دیا۔ اس نے ایڈیٹر کے حتمی رائے دینے کے منصب کا پہلے دن سے احترام کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسی دوران میں اس نے ایک نئی بات بھی دریافت کی تھی کہ اپنی رائے پر قائم رہتے ہوئے، کیسے خود اور صاحب حیثیت و منصب کے حکم کی پیروی کے درمیان توازن قائم رکھنا ہے۔ شروع میں اسے الجھن ہوتی تھی، جب ایڈیٹر اس کی رائے کو اہمیت نہ دیتا اور اپنا فیصلہ تسلیم کرواتا۔ تب اسے کئی بار یہ الجھن ضمیر کی خلش محسوس ہوتی اور رات کو وہ کروٹیں بدلتا، خود کو کوستا اور ایڈیٹر کو گالیاں دیتا، اس کی لیاقت پر شک کرتا اور صحافت کے پیشے پر ہی لعنت بھیجتا، مگر جب اسے اپنے شکم، اور والدین کا خیال آتا (حالاں کہ انھیں اس کے پیسوں کی ضرورت نہیں تھی) تو وہ اٹھ بیٹھتا۔ سر کھجاتا۔ کچھ دیر کے لیے فلیٹ کی چھت پر جاتا اور سوچتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ اردو میں ایم اے کے بعد اخبار میں ملازمت اتفاقاً ملی تھی۔ اب میری عمر سرکاری نوکری کے لیے درکار حد سے اوپر ہو چکی ہے۔ پڑھانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ ان حقیقتوں کو سوچنے کے دوران ہی میں اس نے اپنی رائے کے اظہار اور ایڈیٹر کے اختیار کے درمیان توازن قائم رکھنا سیکھا تھا۔ میں اپنی رائے ضرور دوں گا، مگر اصرار کروں گا نہ ایڈیٹر کی حکم عدولی۔ اس نے یہ بھی دریافت کیا تھا کہ وہ تحریروں پر رائے قائم کر کے، اس دنیا پر اپنے اختیار کو محسوس کرتا تھا جو حقیقت میں اس کی دسترس سے باہر تھی، اور اس میں ایڈیٹر بھی شامل تھا۔ وہ کبھی کبھی دل میں ہنستا کہ وہ کس چالاکی سے ایڈیٹر کی میز سے شروع اور وہیں ختم ہونے والی دنیا پر اختیار کام میں لاتا ہے اور اسے بھنک تک نہیں پڑتی۔ اس وقت بھی ان باتوں کو یاد کر کے وہ ہنس دیا۔ لیکن اس بار وہ ایڈیٹر پر نہیں، اپنے ذہن کی اس عیاری پر ہنسا جو سیدھی سادی حقیقتوں کو سادہ انداز میں قبول کرنے کے بجائے، نئے نئے خیالی راستے تراشنے کے فن میں طاق ہے۔

یہ سیدھی سادی حقیقت ہے کہ صحافیوں کو غائب کیے جانے کے واقعات اس وقت سے ہو رہے تھے، جس وقت سے اخبار شروع ہوا تھا۔ جب بھی وہ سنتا کہ کسی کو پکڑ لے گئے ہیں، گاڑی میں بے ہوش پھینک گئے ہیں، ہاتھ توڑ دیا ہے، سر پر شدید ضربیں ہیں، سرین پر زخم اور توہین کے نشان ہیں، شہر سے باہر کی طرف جانے والے گندے نالے کے کنارے لاش ملی ہے تو اس سمیت سب کا دھیان ایک ہی طرف جاتا تھا اور سب گنگ ہو جاتے تھے۔ ہم منع کرتے تھے، مگر اسے سچ بولنے اور جرأت دکھانے کا جنون تھا۔ یہ جملہ ہر واقعے کے بعد اکثر لوگ دہراتے۔ پھر وہ سب پریس کلب میں جمع ہوتے۔ مذمتی قرار داد پیش کرتے، انسانی حقوق کی مقامی اور عالمی تنظیموں کو واقعے کی مکمل رپورٹ دیتے۔ حالاں کہ سب جانتے تھے کہ یہ ویسی ہی رسم ہے جیسی کسی مردے کو ٹھکانے لگانے کی۔ میرے ساتھیوں نے مجھے بھی ٹھکانے لگا دیا ہوگا۔ اس نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے سوچا۔

اگر وہی تھے تو میں نے کیا کیا تھا؟ اس کے ذہن میں یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ کبھی کوئی چیز اس کے نام سے اخبار میں نہیں چھپی تھی، نہ ہی وہ لکھا کرتا تھا۔ کہیں نہ لکھنا ہی تو جرم نہیں؟ اس نے خود سے پوچھا۔ ہوسکتا ہے کہ جن کا حکم اس دنیا کے چپے چپے پر چلتا ہے انھوں نے لکھنے کا حکم دیا ہو اور میں نے سنا نہ ہو یا اس کان سے سن کر اس کان سے نکال دیا ہو؟ پر وہ مجھے لکھنے کا حکم کیوں دیں گے؟ اس نے سمجھنے کی کوشش کی۔ اس نے محسوس کیا کہ تنہائی میں رہنے سے اور جیسے جیسے وہ کمزور ہوتا جا رہا ہے، اس کے سوچنے اور محسوس کرنے میں وضاحت آتی جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وضاحت سے محسوس کیا کہ اب تک اس کی زندگی بری طرح کے ابہام میں گزری تھی۔ اس کے ذہن میں بس سائے آتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ شاید اس نے اس کے حکم کو بھی اسی حالت میں سنا ہوگا۔ ویسے بھی کوئی خدا لکھ کر کسی کو حکم تھوڑی دیتا ہے۔ اسے اپنے ایک ساتھی کی بات یاد آئی۔ اچھا اخبار نویس وہ ہے جو واقعے سے زیادہ واقعے کے پیچھے دیکھنے کی

صلاحیت رکھتا ہو، اور بولے گئے لفظ کے پیچھے نہ بولے گئے لفظ کو سننے اور اخبار میں نمایاں کرنے کا فن جانتا ہو۔ لیکن یہ تو ادیب کا کام ہے۔ اس نے اپنے ساتھی سے جرح کی تھی۔ ادیب اور صحافی میں بس بال برابر ہی فرق ہوتا ہے اور وہ 'بال' وقت ہے۔ تب اس نے اس بال نما وقت پر زیادہ غور نہیں کیا تھا، پر اس لمحے وہ اسے پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ وہ صحافی کے وقت کے بجائے، ادیب کے اس وقت میں ہے جو لگتا ہے کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اسی ساتھی نے ایک اور موقع پر ایک اور بات بھی کہی تھی جو اسے یاد آئی۔ کامیاب صحافی وہ ہے جو باہر کے حکم کے بجائے، اندر کے حکم پر چلتا ہے۔ اندر، مطلب ایڈیٹر کا حکم؟ نہیں بھائی صاحب، کامیاب صحافی کو پہلے ہی دن اپنے اندر ایک سینسر فٹ کر لینا چاہیے، یہ جو آدمی کا اندر ہے نا، اس میں سب کچھ فٹ کر سکتے ہیں، بڑے بڑے اخلاق، قاعدے قانون، خداؤں کا ڈر اور سینسر۔ جب ایک بار فٹ ہو جائے تو پھر کوئی غلطی نہیں ہوتی، کوئی پکڑا نہیں جاتا۔ جس طرح نیک آدمی کا ہر وقت رابطہ اپنے خدا سے رہتا ہے، اسی طرح صحافی کے اندر کا سینسر ان خداؤں کی آواز سن لیتا اور منشا جان لیتا ہے جو ہر جگہ ہیں۔ اس کے ساتھی نے یہ بات سرگوشی کے انداز میں کہی تھی اور ادھر ادھر چوکنی نظروں سے دیکھا تھا۔ اور سب سے پہلے ان کی آواز اخبار کا مالک سنتا ہے۔ اس پر دونوں ہنس دیے تھے۔

اس کا مطلب ہے کہ ان کے احکام صرف انھی کو ملتے ہیں جو اپنے اندر سینسر فٹ نہیں کرتے۔ میں خود نہیں لکھتا مگر دوسروں کے لکھے کو دیکھتا تھا اور ٹھیک کرتا تھا، اس لیے مجھے سینسر کی ضرورت نہیں تھی۔ میں خود نہیں لکھتا تھا۔ لیکن اس سے بڑا سچ یہ ہے کہ اس سے بڑی بزدلی بھی کوئی نہیں تھی۔ میں دوسروں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ کتنے ہی مضامین اور کالموں میں میرے جملے شامل ہوتے تھے۔ یہ بزدلی تو تھی، سخت بددیانتی بھی تھی۔ میں دوسروں کے لکھے میں مداخلت کرتا تھا۔ بزدلی اور بددیانتی کے ساتھ ساتھ پرلے درجے کی کمینگی بھی تھی۔ میں دوسرے دن دوسروں کے مضامین میں اپنے جملے یا الفاظ دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔ کئی بار اپنے رفقا سے کہتا بھی تھا کہ دیکھو

اس مشہور کالم نویس کا یہ جملہ میرا ہے اور داد اسے مل رہی ہے۔ میں ساتھیوں کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتا تھا۔

لیکن اس نے مجھے لکھنے کا کیوں حکم دیا ہوگا؟ وہ میرے، ان، ہم سب کے بارے میں سب جانتا ہے؛ وہ سب کی زبان جانتا ہے، سب کی اوقات سمجھتا ہے۔ اسی لیے تو حکم دیا ہوگا۔ اب سمجھا۔ وہ اس خیال کے آتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ جیسے اس پر ایک اور بڑا انکشاف ہوا ہو۔ جسے لکھنا آتا ہو اور نہ لکھے تو یہ جرم ہے اور جسے لکھنا آتا ہو اور اس کے حق میں نہ لکھے تو کبیرہ جرم ہے۔ مجھے چھوٹے جرم کی سزا ملی ہے یا بڑے جرم کی؟ اس نے روشن دان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ سزا بڑی ہے تو جرم بھی بڑا ہوگا۔ اسے خیال آیا۔ اب اس نے اپنی سزا کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ قیدِ تنہائی۔ بغیر ٹرائل کے۔ رکے ہوئے وقت میں۔ معمولی بے ذائقہ کھانا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے اندر خود رحمی کا جذبہ پیدا ہونے لگا ہے اور وہ خود کو بے قصور تصور کر کے، ساری دنیا کو ظالم سمجھنے لگا ہے۔ فوراً اسے لگا کہ خود ترحمی سے زیادہ بے ہودہ جذبہ کوئی نہیں اور اس قیدِ تنہائی میں دو بے ہودگیاں جمع نہیں ہو سکتیں۔ دوسری بے ہودہ چیز تاریکی اور روشنی کا یکساں امتزاج تھا، جس کا راز وہ نہیں پا سکا تھا۔ اس نے ان سزاؤں کو یاد کیا جو اس کے ہم پیشہ لوگوں کو دی گئی تھیں۔ سب نے بتایا تھا کہ سب سے بڑی سزا سب کے سامنے، تیز روشنی میں فک کیا جانا ہے، ننگے الٹے بدن کے ساتھ ننگی گالیوں کو سننا اور سہنے کی تاب نہ لاتے ہوئے رونے سے بھی خود کو معذور پانا اور اپنی ناک کو فرش میں دھنسانے کی کوشش کرتے ہوئے اسے توڑ ڈالنا، اور عین سرین کے بیچ غلیظ سیال کو کھانستے، ڈکراتے وحشیوں کی تھوکوں سمیت محسوس کرنا اور ان خداؤں کو یاد کر کے خود کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنا جو اپنی ہستی کا اظہار دنیا کی بدترین دہشت کے ذریعے کرتے ہیں اور ٹھوکروں پر آئے، بے بس انسانوں کا ٹھٹھہ کرتے ہیں۔ میری سزا میرے لیے بڑی ہوگی، سب سے بڑی نہیں۔ اس نے آسمانی خدا کا شکر ادا کیا۔ سجدہ کیا۔ مگر تھوڑی دیر بعد

اسے سخت تاسف نے آ گھیرا۔ اسے اپنے تشکر کا جذبہ، خودغرضی اور بزدلی سے پھوٹتا محسوس ہوا۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی خودغرضی و بزدلی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ اس نے یاد کیا، جب پہلی بار اسے اپنے ساتھیوں کی سزاؤں کا علم ہوا تھا تو اس نے زبان سے افسوس کا اظہار تو کیا تھا، مگر اطمینان بھی محسوس کیا تھا کہ وہ بچ گیا۔ اس کا یہ اطمینان بزدلی وخودغرضی کے ساتھ، اپنے مستقبل کو دوسروں سے الگ تصور کرنے کی جہالت کی پیداوار بھی تھا۔ اپنے ظہور کے وقت معمولی سمجھے جانے والے واقعات کس طرح آنے والے وقت میں حقیقی بڑے اور ہیبت ناک واقعات کو جنم دیتے ہیں، اس کا علم ہونے پر اس کا دل افسوس اور دکھ سے بھر گیا۔

اس نے ڈاڑھی میں سخت کھجلی محسوس کی۔ خاصی بڑھ آئی تھی۔ یہ پہلا اطمینان کا لمحہ تھا جسے اس نے پورے حواس سے محسوس کیا۔ وقت رکا نہیں۔ وہ صرف دھوکے میں ہے۔ اس نے اس خدا کی ذہانت کو داد دی جس نے اس کو قید کرنے کے لیے ایسی جگہ تعمیر کی، جہاں آدمی وقت کو رکا سمجھے اور کسی بھی واقعے کو سمجھنے میں بے بس ہو جائے۔ لیکن آدمی کی بے بسی کا جہاں انت ہوتا ہے وہیں کچھ اختیار کی صورت بھی پیدا ہوتی ہے، اگر بے بسی کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے دریافت کیا کہ اس کے پاس سب سے بڑی طاقت نئے خیال سوچنا نہیں، جس میں یہاں سے نکلنے کا خیال بھی تھا، بلکہ یادداشت ہے۔ نئے خیال میں سب سے بڑی قباحت یہ تھی کہ وہ سائے کی طرح آتا، گزر جاتا تھا۔ یہ سلسلہ لامتناہی تھا۔ دوسری خرابی یہ تھی کہ اس کا سر پیر اس دنیا میں نہیں تھا جو پتھر کی طرح سخت اور اتنی ہی حقیقی ہے، مگر اس کا دھوکا پیدا کرنے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ وہ اس کی ہستی کے کسی ایسے حصے میں نمودار ہوتا، جس کے بارے میں وہ خود کچھ وثوق سے کہنے سے قاصر تھا، اور یہی بات خیال میں ایک قسم کی گہری دل چسپی اور کسی کسی وقت جنسی قسم کی دل چسپی پیدا کر دیتی تھی اور یہ بات اسے کافی خطرناک لگی تھی، اس کے اندر ایک شدید آرزو پیدا ہوتی کہ کوئی ہو جسے وہ یہ سب بتائے۔ وہ کئی مرتبہ دروازے تک اس عزم

کے ساتھ جاتا کہ وہ اسے توڑ ڈالے گا، مگر اس کی یہ کوشش بس یہ احساس دلانے پر ایک مایوسی کے ساتھ ختم ہوتی کہ وہ مسلسل کمزور ہو رہا ہے۔ یادداشت کم از کم اس قدر حقیقی تھی کہ اس کا سر پیر اصل دنیا میں تھا، کبھی۔ دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ سائے کی طرح گزرتی نہیں تھی، تصویر کی طرح رک جاتی تھی اور اسے رخ بدل بدل کر دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے یادداشت کی مدد سے کوئی کھیل کھیلنے کا فیصلہ کیا جس کا ایک نیم واضح خاکہ اس نے ذہن میں سوچا۔ مدت بعد اسے معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ اس کے اس بے اختیاری میں اٹھائے گئے قدم سے مختلف نہیں تھا جو وہ دروازے تک جاتا اور اسے توڑنے یا کھولنے کی کوشش کرتا تھا۔ اختیار اور آزادی کی آرزو جس قدر شدید ہوتی جاتی ہے، اسی نسبت سے آدمی خود کو حالات اور خداؤں کے رحم و کرم کے سپرد کرتا جاتا ہے۔ اس نے بعد میں یہ بات بھی تسلیم کی۔

کمرے میں روشنی اور تاریکی یکساں تھی، مگر اس کی حالت یکساں نہیں رہتی تھی۔ کسی وقت اسے لگتا کہ وہ اس کائنات کے سب عظیم راز جان لینے کے قریب ہے، جب وہ پوری وضاحت سے باتیں سوچ رہا ہوتا، کسی وقت لگتا کہ اس رکے ہوئے وقت میں ہر شے لغو ہے، کائنات کے عظیم راز اور ان کو جاننے کی آرزو دونوں۔ کسی وقت وہ موت کی شدید آرزو محسوس کرتا اور کسی وقت محض کھانے کی طلب اور کسی وقت وہ یہاں سے آزاد ہونے کا منصوبہ بناتا۔ روشن دان تک پہنچنے کی کوشش کرتا۔ اس رسی کو پکڑنے کی سعی کرتا جس سے کھانا لٹکایا جاتا تھا، کہ شاید اسی طرح وہ باہر دیکھ تو سکے۔ باہر کو جاننے کی خواہش کا شدید غلبہ اس پر اکثر طاری رہتا۔ کسی وقت زور زور سے چلاتا۔ کچھ گاتا، کچھ لوگوں کے نام لیتا، کسی کو گالی دیتا، کسی کو دعا اور کسی پر لعنت بھیجتا۔

اور کسی کسی وقت اس پر ایک ایسی حالت طاری ہوتی، جسے وہ نہ برداشت کر سکتا، نہ سمجھ سکتا۔ یہ حالت کتنی دیر طاری رہتی، اسے بھی سمجھنے سے عاجز ہو جاتا، جس سے وہ حالت، اپنے ساتھ ایک عفریت کو لیے عود کر آتی۔ وہ خود کو جنگ اور تشدد پر مائل پاتا۔ اس نے اس شخص کا ایک

خاکہ ذہن میں وضع کرلیا تھا جو اسے روزانہ روشن دان سے کھانا رسی کے ذریعے لٹکا کر بھیجا کرتا تھا۔ وہ ایک بوڑھا، جھکی کمر والا، دمے کا مریض شخص ہوگا، تقریباً ویسا ہی جیسا اس کے والد کے گھر کا مالی تھا اور جوان کے گھر کے پچھواڑے ایک خستہ حال کمرے میں رہتا تھا۔ حالاں کہ اس نے اسے کبھی کھانستے سنا تھا نہ اس کے قدموں کی کوئی آہٹ ہی اس تک پہنچی تھی۔ بچپن میں اس نے ایک مرتبہ اپنے گھر کے بوڑھے مالی سے کھانا کھایا تھا، صرف اس تجسس کے تحت کہ اس کے گھر کے باہر کس قسم کا کھانا لوگ کھاتے ہیں۔ اسے اس نے اپنے ان کھیلوں کا ایک حصہ سمجھا تھا جو وہ سخت گیر والد سے چھپ کر کھیلا کرتا تھا اور اس دوران میں اپنے اندر اسی طرح کی کوئی نئی مگر امید افزا کیفیت محسوس کرتا تھا، جس کی مثال اسے اپنے گھر کے لان میں کسی بیج کو پھوٹتے دیکھ کر محسوس ہوتی تھی۔ ایک چیز کو روزانہ رونما ہوتے دیکھنا، مگر وہ کیوں کر رونما ہوتی ہے، اسے جاننے میں خود کو بے بس پانا ہی وہ حقیقت تھی جو اس کے دھیان کو بوڑھے مالی کی طرف لے جاتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جب کھانا روشن دان سے نیچے کی طرف آیا تو اس نے کھانے کو ٹھوکر دے ماری۔ کھانا کیسے دیوار پر الٹ گیا، اسے دیکھنے کے بجائے وہ یہ سوچتا کہ اس کا پاؤں سیدھا بوڑھے مالی جیسے کھانستے شخص کے سینے پر پڑا ہے اور وہ کسی دوسری سنگی دیوار سے جا ٹکرایا ہے۔ وہ مسلسل کئی ٹھوکریں مارتا، یہاں تک کہ ہانپ جاتا اور اس کے تیز بے ترتیب سانسوں سے کمرے میں زندگی کے آثار نمایاں ہونے لگتے۔ وہ اونچی آواز میں گالیاں دیتا، اس جبلی یقین کے ساتھ کہ کھانا پہنچانے والا شخص سن رہا ہے اور پیچ و تاب کھا رہا ہے اور کسی ماورائی رابطے کے ذریعے اس کی گالیاں ان سب تک پہنچ رہی ہیں جو اسے یہاں لائے ہیں۔ یہ یقین اس میں تشدد کو مزید بھڑکا دیتا۔ وہ دیوار پر پاؤں مارتا، مکا مارتا، اس خیال کے ساتھ کہ وہ دیوار سے لگا کھڑا ہے، اور اسے اس کے ہاتھ پاؤں کی ہر ضرب اس پر پڑ رہی ہے۔ جس لمحے اسے یہ حیران کن خیال آتا کہ اس کے کمزور ہوتے وجود میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے تو وہ اس طاقت کو مزید تشدد آمیز طریقے سے کام میں لاتا۔ وہ اس

طاقت کے چلے جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ اس خیال کو شدت سے محسوس کرتا کہ اگر یہ طاقت باقی نہ رہی تو وہ یہاں سے کبھی باہر نہ جا سکے گا۔ لیکن وہ طاقت باقی نہ رہتی، وہ رونے لگتا اور اپنا سر دیوار سے دے مارتا۔ بالآخر جب وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں سنگی فرش پر گرتا تو اس کی نظر دیوار پر لگے خون پر پڑتی، اور مکمل بے ہوش ہونے سے پہلے ایک مدھم سا خیال اسے آتا کہ کوئی اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کسی ایسی دنیا میں لے جا رہا ہے جہاں کھانا روشن دان سے نہیں پھینکا جاتا۔

سب سے پہلے اسے اپنا سانس محسوس ہوتا، پھر جسم کی ناقابل برداشت ٹیسیں۔ کسی قدیمی جذبے کے تحت گھسٹتا ہوا پہلے غسل خانے میں جاتا، پھر وہ ان ٹکڑوں کو اٹھاتا جنھیں وہ ٹھوکریں مار چکا تھا۔ چیونٹیوں کو الگ کرتا، انھیں پانی سے صاف کرتا اور منہ میں ڈالتا۔ چیونٹیوں سے زیادہ خود پر اور خود سے زیادہ اس کمرے سے باہر پوری دنیا پر لعنت بھیجتا اور ذلت و بے بسی کے احساس کے ساتھ مشکل سے اٹھ بیٹھتا۔ سر، پاؤں، ہاتھ کے زخموں کو سہلاتا، جن میں سے بعض پر چیونٹیاں چمٹی ہوتیں۔ اگر یہی حالت رہی تو یہ حقیر مخلوق مجھے کھا جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی وہ اس حالت کو سمجھنے کی کوشش کرتا اور خود سے عہد کرتا کہ وہ اپنے اعصاب پر قابو رکھے گا۔ وہ اپنے اختیار کو اپنے ہاتھ نہیں جانے دے گا۔ یہ عہد اکثر ٹوٹ جاتا۔ شروع میں اسے شدید تاسف ہوتا، پھر کم ہوتا جاتا۔

وہ کمرے کا چکر لگا رہا تھا۔ بار بار اس کی نگاہ دیوار پر لگے خون کی طرف اٹھ رہی تھی، جس کا رنگ نیم سیاہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک چکر میں اسے لگا کہ جیسے پورے کمرے میں خون بہہ رہا ہے، غسل خانے کے پانی سے خون نکل رہا ہے۔ کمرے سے باہر خون کی بارش ہو رہی ہے، چھت پر خون ہے۔ اس کا دفتر خون سے بھر گیا ہے، اس کا فلیٹ خون سے بھر گیا ہے اور کسی بھی وقت وہ گر سکتا ہے۔ اسے لگا خون اس کی گردن تک پہنچ گیا ہے۔ اس نے اپنا سانس بند ہوتے محسوس کیا اور بھاگنے کی کوشش میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ماتھے کا زخم کھل گیا اور تازہ خون کی لکیر پھوٹ پڑی۔ وہ دیوار میں سر دیے رونے لگا۔ اسے وقت کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ وہ

وقت کوصرف اپنی حالتوں کی تبدیلی کی مدد سے کچھ کچھ پہچاننے لگا تھا اوران میں بھی وہ ترتیب قائم نہیں رکھ پاتا تھا۔ سب کچھ گڈ مڈ ہوجاتا تھا،لیکن ذراسی امید اسے حوصلہ دیتی تھی کہ وہ اپنی حالتوں کو یاد کرسکتا تھا اوران کے ذریعے وقت کے تسلسل کا کچھ اندازہ کرسکتا تھا۔ وہ حساب لگا رہا تھا کہ جب اس کے ماتھے کا زخم چوتھی بار کھلا تھا تو اسے وہ لمحے یاد آئے جب اس کا ذہن وضاحت سے سوچ سکتا تھا۔لیکن وہ دورانیوں کا حساب لگانے سے قاصر ہوتا۔اسے تبھی یاد آیا کہ اس نے خیال پر یادداشت کو اہمیت دی تھی۔ ایک نامعلوم مگر طاقت ور جذبے کے بل پر اٹھا اور اپنا ماتھا دیوار پر دے مارا۔اس نے درد کو حاوی نہیں ہونے دیا۔ دیوار پر لگنے والے خون کو ہاتھ سے چھوا۔ تازہ خون کو ہوش وحواس میں چھونے کا اس کا یہ اوّلین تجربہ تھا۔ وہ کافی دیر تک پرانے جمے خون کو تازہ خون سے ملاتا رہا۔لکیریں کھینچتا رہا۔ یہ معمول جاری رہا۔ایک نشست کے خاتمے پر وہ کوئی مخصوص علامت بناتا۔ پہلے اس نے نمبر درج کرنے کا سوچا، پھر یہ خیال جھٹک دیا کہ یہ اس جذبے سے مطابقت نہیں رکھتا تھا جس نے اسے یہ سرگرمی اختیار کرنے کی راہ دکھائی تھی۔ وہ وقت کو ایک اپنی زبان میں سمجھنا چاہتا تھا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اس نے جتنی علامتیں بنائی تھیں،ان سب کا تعلق اس کی یادداشت میں محفوظ لوگوں، چیزوں اور منظروں سے تھا جسے صرف وہی سمجھ سکتا تھا۔ وہ جب دوسری دیوار کے پاس کھڑا ہوکر اس دیوار کو دیکھتا تو اطمینان کا گہرا سانس لیتا۔ یہ ایک انوکھی، اپنی طرز کی، اپنے ہی خون سے بنائی گئی پینٹنگ ہے،اس سفاک دنیا کی بدترین، سنگی دیوار پر بنائی گئی ایک پینٹنگ، وہ سوچتا۔ اس کا مطلب کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میں بھی نہیں۔ وہ سب خدا بھی نہیں۔ زبان نہ سہی ایک تصویر میں نے بھی ایجاد کرڈالی۔ اس میں مطلب ہو نہ ہو، مجھے یقین ہے کہ اسے جس حالت میں بنایا گیا ہے، وہ انتہائی گہرے مطلب کی حامل ہے،اوراسے میں سمجھتا ہوں،صرف میں۔ اس نے اپنے اندر خداؤں جیسا اعتماد محسوس کیا۔

پہلے ایک جیپ کے انجن کے بند ہونے کی گھرڑ گھرڑ سنائی دی، پھر قدموں کی

دھمک، جس کے تلے کنکریوں کے کچلنے کی دم توڑتی چیں اور پھر ایک قدرے طویل چیں سے دروازہ کھلا۔ اگر یہ سب نہ ہوتا تو وہ دروازہ کھلنے کو ان دھوکوں میں شمار کرتا جن کے سلسلے میں اس نے حیران ہونا چھوڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کو اس نے کھڑے ہونے کی انگیخت محسوس کی، مگر پھر دیوار سے لگا بیٹھا رہا۔ بعد میں اس نے اپنے اس عمل کی توجیہ کرتے ہوئے اپنے دوست علی کو بتایا کہ اس نے بیٹھے رہنے کا فیصلہ کر کے دراصل اپنے اس انسانی وقار کی حفاظت کی، جسے اس نے اس سارے عرصے میں خود سے جھگڑ کر حاصل کیا تھا۔ قید کی طرح آزادی بھی ایک دھوکا ہے، مگر دونوں کے سلسلے میں آدمی کا عمل دھوکا نہیں ہے۔ علی قید کو دھوکا سمجھنے سے قاصر رہا تو اس نے ان دھوکوں کا ذکر کیا جن سے وہ اس سارے زمانے میں گزرا تھا۔

ہمیں یقین ہے، تم ہمیں یہاں ایک پل کے لیے نہیں بھولے ہو گے۔ ہمیں کوئی نہیں بھول سکتا۔ ان میں سے اس کے قریب آ کر ایک بولا۔ باقی دو کمرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

اللہ بہت یاد آیا ہوگا۔ وہی دوبارہ بولا۔ باقیوں نے اس کے بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

اللہ بھی.....اور.....وہ سب.....خدا.. بھی...ہمارے تمھارے خدا....وہ بہ مشکل بول رہا تھا۔

لگتا ہے کتے کی دم سیدھی نہیں ہوئی۔ وہی ایک بار پھر بولا اور بولتا چلا گیا۔ یہ تم انٹ شنٹ لکھنے والے .....اتنی جرأت.....تم میں کیسے آجاتی ہے؟ اچھا تو تم یہاں اپنے نقش چھوڑ کر جا رہے ہو۔ اپنے خون سے۔ کاش یہ خون بڑے مقصد کے لیے گرا ہوتا!.....اس کا مطلب تو ذرا سمجھاؤ، کیا بنایا ہے؟.....لیکن یہ تمھاری غلط فہمی ہے.....اس سے پہلے بھی تم جیسے اس طرح کی بکواس کرتے رہے ہیں۔ سمجھتے ہیں وہ اپنی نشانیاں چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ ابھی یہ سب صاف ہو جائے گا۔ صرف ایک خون ہمیشہ باقی رہتا ہے اور رہے گا، سمجھے۔

وہ چپ رہا اور لنگڑاتے ہوئے ان کی جیپ میں ڈھ پڑا۔

بوڑھے کا قتل

تم نے ایک بوڑھے شخص ہی کو قتل کیوں کیا؟ کیسا انوکھا سوال ہے! بچوں، عورتوں، جوانوں میں سے کسی کو قتل کرو۔ حرج نہیں۔ بوڑھے کو مت مارو۔ یہی کہنا چاہتے ہو نا۔ وہ پہلے بغلیں جھانکتے ہیں، پھر میری آنکھوں میں۔ ہمارا مطلب ہے کہ بعض حالات میں، جن کے وقوع پذیر ہونے کی پیش گوئی نہیں کی جا سکتی، وہ کیا رخ اختیار کریں گے، اس بارے میں قبل از وقت کوئی کچھ نہیں جان سکتا، قتل کیا جا سکتا ہے، مگر بوڑھے کا قتل ان حالات میں بھی نہیں۔ پہلے سوال انوکھا تھا، اب منطق نرالی ہے۔ انوکھا سوال ہو کہ نرالی منطق دونوں اس الجھن سے پیدا ہوتے ہیں جو دوسروں کو جاننے کی کوشش کرنے کے بجائے، اپنے ادھورے علم پر تکبر کرنے سے پیدا ہوتے ہیں۔ میرے اور مجھ جیسے غریب متکبر لوگوں میں گھرے رہتے ہیں۔ وہ ہماری ایک نہیں سنتے۔ وہ نہیں سنتے کہ جن حالات کے بارے میں ہم کچھ فرض تک نہیں کر سکتے، جو کسی اچانک افتاد کی طرح ہم پر آن وارد ہوتے ہیں، ہمیں ماضی کے اس طاقچے تک پہنچنے کی اجازت تک نہیں دیتے، جہاں غیر متوقع واقعے کا قفل کھولنے کی چابی پڑی ہوتی ہے، تب ہم نہیں وہ حالات ہمارے ارادے کے حاکم ہوتے ہیں۔ ایسے میں کچھ بھی ممکن ہے۔ قتل خواہ کسی بوڑھے ہی کا کیوں نہ ہو، ممکنات کی اسی سرنگ میں، جس کا دوسرا سرا کسی نے نہیں دیکھا، ایک معمولی سا تاریک دھبا ہے۔ وہ آخری لحظ جو ہم دونوں کی یادداشت میں اب تک تازہ ہے، کیا وہ ہمیں

ممکنات کی اسی سرنگ میں ذرا آگے تک نہیں لے گیا تھا؟ بچے، عورتیں، مرد، جوان، بوڑھے جلی سیاہ لکڑیوں کی طرح پڑے تھے۔ ایک دوسرے میں الجھے، ایک دوسرے سے لاتعلق۔ دنیا جہان سے لاتعلق۔ دنیا جہان ان سے لاتعلق۔ تمھارے منھ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ یہاں کچھ بھی ممکن ہے۔ جس وقت تم نے یہ کہا تھا اسی وقت کچھ سوکھے سڑے ڈھانچے لڑکھڑاتے وہاں آئے تھے اور ہڈیوں پر مڑھا ہوا، بچا کھچا انسانی گوشت کاٹنے لگے تھے۔ تم نے کہا: یہ کیسے ممکن ہے؟ پھر خود ہی بولے تھے: انسانوں کی دنیا میں بہت کچھ ایسا واقع ہوتا ہے جو کسی اور دنیا ہی میں سوچا جا سکتا ہے۔ تم اس دوسری دنیا کے بارے میں سوچنے کے خیال ہی سے لرزنے لگے تھے۔ حالاں کہ یہ لرزہ تمھیں اس سچائی کو قابل برداشت بنانے کے لیے ضروری تھا جو ہم سب کے تعاقب میں ہے اور جس سے ہم فرار کے راستے تلاش کرتے ہیں۔

وہ بار بار پوچھتے ہیں۔ بوڑھے کا قتل؟ ایک عام چیز کو معمول کی دنیا سے باہر کی شے کیوں بنانا چاہتے ہو؟ اس بار وہ مجھے غصے سے دیکھتے ہیں۔ لال پیلے ہو کر کہتے ہیں۔ جانتے ہو بڑھاپا کیا ہے؟ ہر ایک کو نصیب ہوتا ہے؟ ایک نوجوان یہ بات نہیں سمجھتا۔ نہیں سمجھ پاتا۔ یہ عمروں کے مراحل، محض ماہ و سال کی گنتی نہیں ہیں۔ ہر عمر ایک دیوار ہے۔ دیوار کے ساتھ کھڑے ہوں تو آگے کچھ نظر نہیں آتا۔ اس کی منڈیر پر چڑھ جائیں تو اتنی ہی دور تک نظر آئے گا، جتنی دیوار اونچی ہوگی۔ آدمی اپنے قد سے نہیں، اپنی عمر کی دیوار سے دنیا کو دیکھتا ہے۔ تم جس دیوار کے پاس کھڑے ہو، یہاں سے وہ سارا راستہ نظر نہیں آتا جس پر چل کر کوئی شخص بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ اگر نظر آتا تو تم اس بوڑھے کا قتل ہرگز نہ کرتے۔ تمھیں اسے قتل کرنے کا خیال ہی نہ آتا۔ وہ بوڑھا شخص تمھاری ماں کا مجرم تھا۔ اس نے تمھاری ماں پر بدچلنی کا الزام لگایا اور اس کے شکم پر لاتیں چلائیں جس میں تم دو ماہ کے تھے۔ وہ باہر چلا گیا۔ تم نے ماں سے وعدہ کیا تھا کہ تم ماں کی ذلت کا بدلہ لو گے۔ تم اپنی سچائی کو ٹھیک ٹھیک سمجھنے کا دعویٰ کر سکتے ہو؟ تم نے ماں کی ذلت کا بدلہ لیا یا ان

لاتوں کا جن کے بارے میں تمھیں ماں نے بتایا کہ تمھیں بھی لگیں یا یتیمی اور غربت کی زندگی بسر کرنے کا؟ جو آدمی اپنی سچائی کو ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتا، اسے سمجھنے کی کوشش میں گومگو میں پڑ سکتا ہے، وہ قتل جیسا یک ہدفی فعل کس بنا پر انجام دے سکتا ہے؟ تم ماں سے محبت اور اپنی عزت نفس مجروح ہونے کی اس باریک لکیر کو اس ذہن میں واضح دیکھ سکتے ہو، جہاں چیزیں ہر وقت ایک دوسرے میں ادھڑے سویٹر کی طرح الجھی رہتی ہیں؟ اصل بات یہ ہے کہ تم نے اپنی عمر کی دیوار پر کھڑے ہو کر خود ہی کو دیکھا، اس راستے کو نہیں جہاں سے گزر کر کوئی بڑھاپے کو پہنچتا ہے۔ اگر دیکھ سکتے تو تمھیں کبھی قتل کا خیال نہ آتا۔ قتل کا خیال، جرم کے سب خیالوں سے الگ ہے اور بوڑھے کے قتل کا خیال تو ہر طرح کے خیالوں سے الگ ہے۔ جی ہاں ہر طرح کے خیالوں سے۔ یہ خیال آ ہی اسی شخص کو سکتا ہے جو ایک لمحے کے طاغوت کا شکار ہو۔ ایسا شخص اپنا گلا گھونٹ دے، یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے، لیکن وہ ایک بوڑھے کا ٹینٹوا دبائے، یہ قبول نہیں۔ تم پوچھتے ہو، بوڑھوں میں کیا استثنائی بات ہے؟ سنو، بڑھاپا خود ایک استثنا ہے۔ اس پر وہ قوانین لاگو نہیں ہوتے، جن کا اطلاق عمر کے دوسرے مراحل پر کیا جاتا ہے۔ قتل تو قانون ہے ہی نہیں۔ قتل سے پہلے کی حالت ایسی ہے کہ قانون تو کیا، تصور کی گرفت میں نہیں آتی۔ قتل کے بعد کی حالت تصور کی گرفت میں آجاتی ہے، اس لیے سب قوانین قتل کے بعد کی حالت سے متعلق ہیں۔ لیکن ایک بوڑھے شخص کا قتل، قتل سے پہلے کی ناقابل گرفت حالت ہے، اسی لیے اس کے لیے کوئی خاص قانون بنایا ہی نہیں گیا۔ بڑھاپا استثنا ہے، اس کے قتل کے لیے الگ قانون ہونا چاہیے تھا، پر نہیں ہے۔ وجہ تم جان گئے ہو۔ بڑھاپا موت کو مسلسل شکست دیے چلے جانے سے طاری ہونے والی تھکان ہے۔ یوں تو دنیا میں کئی گمراہ کن خیالات ہیں---اور انھی میں لوگ جیتے ہیں اور تعجب ہے کہ خوش بھی رہتے ہیں---پر سب سے گمراہ کن یہ خیال ہے کہ بڑھاپا موت کی طرف متواتر بڑھتی ہوئی حالت ہے۔ بڑھاپا موت کو پرے دھکیلتی اور شل ہوتی ہوئی حالت ہے۔ وہ کون سا

لمحہ ہے، جب موت کا ہاتھ آدمی کی گردن کے آس پاس نہیں ہوتا۔ کچھ اس ہاتھ کو محسوس کرتے ہیں، کچھ دیکھ بھی لیتے ہیں اور اکثر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی جوانی تک موت کے ہاتھ سے بچ رہتا ہے تو یہ اس کی خوش قسمتی ہے، لیکن جو شخص بڑھاپے کو پہنچتا ہے، وہ موت کے خلاف جنگ میں کچھ اہم کامیابیوں کے بعد ہی پہنچتا ہے۔ تم کیا جانو موت کے خلاف جنگ کس قدر اعصاب شکن ہوتی ہے۔ اس جنگ میں ہار جیت کے کوئی معنی نہیں، دیکھنے والی بات یہ ہے کہ کوئی اس جنگ کو کتنا طول دے سکتا ہے۔ جس بوڑھے شخص کو تم نے مار ڈالا، اس نے کتنی جدوجہد سے اس جنگ کو طول دیا تھا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ جس وقت اس نے تمھاری ماں کو گالیاں اور دھکے دے کر اکیلا چھوڑ دیا تھا، وہ اس وقت کوئی جنگ نہیں لڑ رہا تھا۔ اس نے ایک زندگی پر دوسری طرح کی زندگی کو ترجیح دینے کا ایک وحشیانہ ڈھب اختیار کیا تھا۔ جس شخص سے کوئی بھی بے ہودگی سرزد ہوتی ہے، وہ کوئی نہ کوئی جنگ لڑ رہا ہوتا ہے۔ جنگ وہی لڑتا ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے، اپنے طریقے سے۔ ایک دن تم اس حقیقت کو پا لو گے کہ ہر طرح کی جنگ دراصل موت کے خلاف جنگ ہے، لیکن یہ اس وقت ہوگا جب تم موت کو پہچان لو گے، جب تم موت کو اپنی موت سے الگ کر کے دیکھنے کی وہ اہلیت حاصل کر لو گے جو اپنی موت کا ہیبت ناک سامنا کرنے کے بعد ہی ملتی ہے اور جس کے لیے ان دیوتاؤں کا ظرف بھی چھوٹا پڑتا ہے، جنھیں تم اپنی زندگی کی کڑی سچائیوں سے بھاگنے کی خاطر، اپنے تخیل سے گھڑ لیتے ہو۔ تمھاری یادداشت سے وہ کہانی محو نہیں ہوئی ہوگی۔ تمھارے ننھیال کے شہر کی اس عورت کی کہانی جس کا شوہر پہاڑوں میں ان لوگوں کو بچاتے ہوئے مارا گیا تھا، جن کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ملاقات تو کجا انھیں کبھی دیکھا تک نہیں تھا۔ ان کے لیے وہ کسی طرح کے جذبات نہیں رکھتا تھا اور نہ جانتا تھا کہ آدمی کے دل میں کوئی ایسا گوشہ ہوتا بھی ہے کہ نہیں، جہاں ان دیکھے لوگوں کی زندگی بچانے کی خاطر اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کا جذبہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ جن لوگوں کے خلاف جنگ لڑ

رہا تھا، انھیں بھی نہیں جانتا تھا اور نہ اس سے واقف تھا کہ جن کی شکلیں بھی ذہن میں نہ آئیں انھیں دشمن کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔اس کی تیس سالہ زندگی میں کوئی ایسا شخص نہیں آیا تھا جسے وہ اپنا جانی دشمن سمجھتا اور جسے ختم کرنے کے لیے اس کی روح ہر طرح کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوتی۔وہ لاعلمی کی مطلق حالت میں تھا۔ایسے شخص کے لیے گولی چلانا اور گولی کھانا بہت آسان ہوتا ہے۔جس وقت اس بنکر پر دشمن کا میزائل گرا تھا جہاں وہ اسی ان دیکھے دشمن کی طرف بندوق تانے بیٹھا تھا، اس وقت وہ لاعلمی کی مطلق حالت سے سخت بیزار تھا، قریب تھا کہ وہ یوں ہی بندوق کا ٹریگر دباتا، اسے اپنی بیوی، بوڑھی ماں، معذور باپ اور ان سے زیادہ اپنے دو بچے یاد آگئے تھے اور اس کی آنکھیں نم ہوگئی تھیں۔آخری سانس لینے سے پہلے، اسے ثانیے بھر کے لیے یاد آیا کہ اس سے وہ اپنی گیلی آنکھیں پونچھ رہا تھا، جب میزائل اس کی طرف آرہا تھا۔یہ خیال اس برق رفتاری سے آیا تھا اور اتنے کم وقت کے لیے آیا تھا کہ وہ یہ محسوس نہ کرسکا تھا کہ اس کے ساتھ ندامت تھی یا تشکر کا احساس تھا کہ کم از کم آخری لمحے وہ صرف اپنے بچوں کو یاد کررہا تھا۔سال بھر کے جھگڑے کے بعد اس شہید کی جوان بیوہ کی پنشن اس کے ساس سسر اپنے ہاتھ میں لینے میں کامیاب ہوگئے تھے۔اسے ہفتے میں دو بار آدھی رات گھر سے باہر گزارنی پڑتی تھی۔سحری کے وقت جب اس کی ڈیڑھ سال کی بیٹی اس کا دودھ پیتی تھی تو وہ بار بار اپنی چھاتیوں کو نلکے کے تازہ پانی سے دھوتی تھی اور روتی تھی۔وہ کس کے لیے اور کس کے خلاف جنگ کررہی تھی، اپنے طریقے سے؟ اپنے طریقوں سے لڑی گئی جنگوں میں بے ہودگی ظاہر ہوکر رہتی ہے۔کل اس کے بیٹے کو کوئی نہ کوئی بتائے گا کہ--- کہ عورتوں کے راز جلد افشا ہونے کے لیے ہوتے ہیں--- جن چھاتیوں کا اس نے دودھ پیا ہے، اس پر کتنے ہی اور ہونٹوں کے نشان ہیں تو وہ کس کے خلاف جنگ کرے گا؟ بتانے والے کے خلاف، ماں کے خلاف، دادا دادی کے خلاف یا اپنے خلاف؟ اس سے وہ انکار نہیں کرسکے گا کہ اسے جنگ میں جھونک دیا گیا ہے۔

جس بوڑھے کو تم نے قتل کیا، اس بوڑھے نے اس جنگ سے علیحدہ ہونا ہی تھا، سب نے علیحدہ ہونا ہے۔ میدان جنگ میں ایک تھکے ہوئے سپاہی پر تلوار چلانا کون سی مردانگی ہے۔ تم نہیں سمجھ سکتے۔ موت کے خلاف جنگ صرف ایک طرح کے لوگوں کو سمجھ آتی ہے۔ وہ جنھوں نے موت کے ہاتھ کی گرفت کو سخت ہوتے محسوس کیا ہو اور ان کے ہوش و حواس بحال رہے ہوں۔ موت کے ہاتھ کو دیکھ لینا ہیبت ناک ہے، مگر اس کی گرفت کو اپنی گردن پر سخت ہوتے محسوس کرنا دہشت انگیز ہے۔ وہ بس ایک لمحہ ہوتا ہے، جس میں کسی التباس کے بغیر، کسی ابہام کے بغیر، دل میں کبھی کبھی ظاہر ہونے والے غیر متزلزل یقین کے ساتھ، سب خارجی اور سب داخلی حواس کی مکمل بیداری کے ساتھ، اور ان حواس کے ساتھ جن سے پہلے ہم واقف ہی نہیں ہوتے، جو زندگی میں بس ایک آدھ بار ہی انگیخت ہوتے ہیں، لگتا ہے کہ سب روشنیاں، سب چہرے، سب یادیں، سب موجود، سب معلوم، حقیقی طور پر موجود اور تخیلی طور پر معلوم بجھ رہا ہے، ہمیشہ کے لیے، اس ابدیت میں تحلیل ہو رہا ہے، جس کا ٹھیک ٹھیک تصور ہم جیتے جی، اپنے بہترین لمحات میں بھی نہیں کر سکتے کہ ابدیت کا تصور ہمیں رواثت میں ملتا ہے، وراثت میں ملی ہوئی ان چیزوں کی مانند جن کا مصرف ہم کم ہی جانتے ہیں۔ بہت کم لوگ ہیں جنھیں اس لمحے کو--- سر پر کھڑی موت کے دہشت انگیز لمحے کو--- یاد رکھنے کا موقع ملتا ہے۔ یہی لوگ موت کے خلاف جنگ کا مطلب سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس جنگ کا مطلب کوئی کوئی سمجھتا ہے اور جس بات کو کوئی کوئی سمجھتا ہو، وہ زیادہ چپ رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کوئی کوئی ہی دوسروں کو قتل کرنے کے ارادے سے باز رہتا ہے۔ جو موت کے خلاف جنگ کا مطلب نہیں سمجھتا، وہ کسی بھی وقت کسی کا بھی قتل کر سکتا ہے۔ مطلب جس نے اب تک قتل نہیں کیا، اس کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ قتل نہیں کر سکتا تھا یا قتل کا ارادہ نہیں رکھتا۔ قتل سے وہی شخص باز رہ سکتا ہے، جس کے وہ حواس جاگ گئے ہوں، جن کا علم ان پانچوں حواس سے نہیں ہوتا۔

وہ بوڑھا شخص جب سے باہر سے لوٹا ہے، میں نے اسے قتل کرنے کا سوچا ہے اور اس قدر سوچا ہے کہ میرے لیے یقین کرنا مشکل ہے کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ دنیا اسے میرا باپ کہتی ہے۔ میں دنیا کی باتوں میں نہیں آنا چاہتا۔ دنیا اس ذلت کو نہیں سمجھتی جسے میں نے اور ماں نے مل کر جھیلا ہے۔ یہ دنیا بھی عجب ہے، میں اس کی باتوں میں نہ آنے کی جتنی کوشش کرتا ہوں، یہ اتنی ہی مجھے اپنی باتوں میں الجھاتی ہے۔ شاید میں بزدل ہوں۔ بزدل سوچتا زیادہ عمل کم کرتا ہے۔ جب سے میں نے اس بوڑھے کو قتل کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا ہے، دنیا نے میرے اندر ایک جنگ شروع کر دی ہے۔ جسے قتل کرنے کے خلاف اندر جنگ شروع ہو جائے کیا اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ یہ دنیا اور اس کی کوکھ سے نکلی خیالوں کی دنیا بھی عجب ہے!!

خاموشی کا سُر

اینکر پرسن پہلے پریشان ہوا، پھر متذبذب اور اس کے بعد خفیف ۔ یہی حالت پروڈیوسر کی تھی۔ پرائم ٹائم کا مقبول ترین پروگرام ،خاص الخاص مہمان اور اہم ترین موضوع۔ گزشتہ تین دن سے پروگرام کا پرومو چل رہا تھا۔ پروگرام شروع ہوئے ابھی بہ مشکل دو منٹ گزرے ہوں گے کہ اینکر پرسن کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ پروڈیوسر نے غیر متوقع صورتِ حال کو سنبھالنے کی جانی پہچانی تکنیک سے کام لیتے ہوئے، اینکر کو مختصر وقفے کا کہا۔ لیکن دو منٹوں میں جو کچھ ہو چکا تھا وہ ملک کے سب سے بڑے ٹی وی کی پوری انتظامیہ کے لیے خفت کا باعث تھا!

منیر صاحب اس ملک کے انتہائی معروف اور معتبر دانش ور تھے جو کم ہی ٹی وی پر آیا کرتے تھے (انھیں مشکل سے آمادہ کیا تھا اور انھوں نے شرط رکھی تھی کہ پروگرام لائیو ہوگا)۔ ان کے تفصیلی تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اینکر نے شکریے کے رسمی کلمات ادا کیے، اپنی بے بضاعتی کا اس مصنوعی انکسار کے ساتھ اظہار کیا، ٹی وی ناظرین جس کے عادی ہو گئے ہیں۔ البتہ پروگرام کے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے اس سینئر اینکر کو واقعی اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ اس کا سبب، مہمان شخصیت کے بارے میں یہ عمومی تاثر تھا (جسے پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہونے والی ان کی غیر رسمی گفتگو نے تقویت دی) کہ وہ کسی بات کو سرسری نہیں

لیتے۔ جانی پہچانی آرا پر سوال اٹھاتے ہیں اور کسی موضوع پر بحث کے لیے، اس کے تعارف کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اینکر پرسن نے تین دن منیر صاحب کی کتابیں دیکھنے اور انٹرویو پڑھنے میں صرف کیے تھے۔ پروگرام شروع ہونے سے پہلے، جب وہ پروڈیوسر کے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو اینکر پرسن نے منیر صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا کہ آپ نے ایک انٹرویو میں بات کی ہے کہ....ہوسکتا ہے میں آپ کے لفظ نہ دہراسکوں، مگر مفہوم شاید یہی ہے کہ.....آپ نے کہا ہے کہ عام سی سیاسی حقیقت ہو یا کوئی عظیم مابعد الطبیعیاتی سچائی، وہ خود ظاہر نہیں ہوتیں، انھیں دریافت کرنا پڑتا ہے اور دریافت کے لیے اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کو کام میں لانا پڑتا ہے۔ سیاسی حقیقت تک تو بات ٹھیک ہے، مگر مابعد الطبیعیاتی سچائی کو انسانی ذہن دریافت کرنے سے قاصر ہے۔ اس پر منیر صاحب مسکرائے اور کہا، شاید آپ ایک آدمی کے ذہن کو ذہنِ انسانی سمجھ رہے ہیں۔ اینکر محجوب ہوا، اور اس کے ساتھ سیٹ پر چلنے کے لیے کہا۔

اینکر موضوع کا تعارف کراتے ہوئے.....ملک میں سیاسی پولرائزیشن یا انتہا پسندی کے اسباب اور سماجی زندگی پر اس کے اثرات.....ایک پل کو سہم گیا تھا کہ کہیں وہ اس موضوع یا اس کو واضح کرنے کے طریقے پر ہی سوال نہ اٹھا دیں۔ پولرائزیشن کو انتہا پسندی کہتے ہوئے وہ خاص طور پر ٹھٹکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پروگرام کا آغاز اس کی خفت سے ہو۔ نیز وہ جس دبنگ انداز میں وہ سیاسی شخصیات کو اپنے انٹرویو میں پچھاڑ دینے کا عادی تھا، اسے کھونے سے ڈر گیا تھا۔ اینکر کا خوف بجا تھا کہ اس کی روزی روٹی اسی دبنگ انداز سے جڑی تھی۔

منیر صاحب نے کوئی ایک منٹ گفتگو کی۔ آغاز اس جملے سے کیا: جس صورت حال کو آپ پولرائزیشن کہہ رہے ہیں، کیا اس کے لیے یہی لفظ مناسب ہے؟ یہ کافی خوفناک لفظ ہے اپنے مطلب کے لحاظ سے، کیا سیاسی صورتِ حال واقعی اتنی خوفناک ہو چکی ہے؟ اگلے چند جملے بھی پروڈیوسر اور اینکر کی توقع سے بڑھ کر تھے۔ پروڈیوسر نے تھمس اپ کا اموجی اینکر کو واٹس

ایپ پر بھیجا۔اس کے بعد.....

پروڈیوسر بھی سیٹ پر آ گیا تھا۔سر خیریت تو ہے نا۔منیر صاحب نے دونوں کو تعجب سے دیکھا۔سر، یہ پانی پئیں۔کیا پہلے بھی ایسا کبھی ہوا ہے؟ منیر صاحب نے اس مرتبہ دونوں کو پریشانی سے دیکھا۔کیمرہ مین،اسسٹنٹ سب جمع ہو گئے۔منیر صاحب کو کون سا پانی دیا تھا؟ چائے کس نے بنائی تھی؟ ہم سب نے وہی پانی پیا ہے اور چائے پی ہے۔کوئی دوسری وجہ ہوگی۔ پروڈیوسر سخت پریشان تھا۔وہ بار بار اپنی گھڑی دیکھتا۔پانچ منٹ گزر گئے۔اشتہارات کی جگہ دیگر پروگراموں کے پرومو چلائے جانے لگے۔دس منٹ گزر گئے۔سر، ایمبولینس منگوائیں؟ منیر صاحب کے چہرے پر سخت ناگواری تھی۔پروڈیوسر انھیں اپنے کمرے میں لے آیا۔لیکن اسی دوران اس نے دو سیاسی جماعتوں کے راہ نماؤں کو فون پر بلا لیا تھا جو پندرہ منٹ میں پہنچ گئے۔ اینکر نے منیر صاحب کی طبیعت کے اچانک بگڑ جانے کی اطلاع افسوس کے ساتھ ناظرین کو دی اور جیسے تیسے پروگرام کے باقی تیس منٹ حریف جماعتوں کے راہ نماؤں کو ایک دوسرے پر گرجنے برسنے کا موقع دے کر گزارے۔

ہمیں اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔نظر انداز کر ہی نہیں سکتے۔یہ واقعہ ہمارے پروگرام میں ہوا ہے۔ڈائریکٹر پروگرام میری سرزنش کر رہے ہیں۔فون پہ فون آ رہے ہیں۔ دوسرے چینلوں سے،عوام کے۔آج کل ہر بات میں سیاست کی جاتی ہے۔منیر صاحب کے بیٹے کا فون آیا ہے۔وہ کافی پریشان ہے۔میں نے ان سے پوچھا ہے کہ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے؟ کہہ رہے ہیں،کبھی نہیں ہوا۔یہ اور پریشانی کی بات ہے۔چائے میں تو کچھ نہیں تھا جو ان کے سامنے رکھی گئی تھی؟ پروڈیوسر نے اپنے کمرے سے ملحق بالکونی میں سگریٹ کے لمبے کش لیتے ہوئے اینکر سے دوبارہ پوچھا جو پروگرام ختم کر کے ابھی آیا تھا۔انھوں نے چائے پینا شروع نہیں کی تھی۔اینکر کے اس جواب سے اسے اطمینان ہوا۔وہیں کھڑے کھڑے پروڈیوسر کو ایک خیال

سوجھا۔ منیر صاحب کے بیٹے کا نمبر ملایا، جو اسے لینے کے لیے راستے میں تھا۔

منیر صاحب کتنی زبانیں جانتے ہیں؟ پروڈیوسر نے پوچھا۔

کیا مطلب ہے آپ کا؟ منیر صاحب کے بیٹے کے لیے یہ سوال غیر متوقع تھا۔

ہوسکتا ہے، وہ اس زبان میں بات کررہے ہوں، جو ہم نہیں جانتے۔ پروڈیوسر نے منیر صاحب کی حالت کو سمجھنے کے لیے مفروضہ پیش کیا۔

وہ اردو، انگریزی، فارسی، پنجابی اور کچھ کچھ عربی جانتے ہیں۔ منیر صاحب کے بیٹے کا جواب پروڈیوسر کو مفروضے کو ختم کرنے کے لیے کافی تھا۔

تب تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔ آپ جلدی پہنچیں۔

منیر صاحب کی عمر ستر سے تو اوپر ہی ہوگی۔ اس عمر میں الزائمر عام بیماری ہے۔ اگر آدمی باتیں بھول سکتا ہے تو زبان بھی تو بھول سکتا ہے؟ پروڈیوسر نے دوسرا مفروضہ پیش کیا۔

میری دادی الزائمر کی مریضہ ہے۔ وہ بار بار نمازیں پڑھتی ہے۔ میرے اور میرے بچوں کے نام بھول جاتی ہے۔ ابا کا نام نہیں بھولتیں۔ گھر جاؤں تو بار بار ملتی اور پوچھتی ہیں کب آئے؟ مگر اسے بچپن کی سب باتیں یاد ہیں۔ اینکر نے یہ مفروضہ بھی رد کردیا۔

منیر صاحب کا چہرہ لال تھا اور آنکھیں انگارہ۔ ان کے بیٹے نے انھیں گھر چلنے کو کہا۔ وہ بڑبڑائے۔ بیٹے کو تب اندازہ ہوا کہ پروڈیوسر اس قدر پریشان کیوں تھا اور کیوں ان سے الٹے سیدھے سوال کررہا تھا۔ ابا، آپ.....؟ منیر صاحب گرج دار آواز میں بڑبڑائے۔

ٹی وی سٹیشن سے گھر کا راستہ پندرہ کلومیٹر تھا۔ راستے میں تین مرتبہ شہریار نے ان کا ہاتھ پکڑ کو پوچھا ابا کیا ہوا؟ پہلی مرتبہ منیر صاحب نے ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے ہاتھ چھڑا لیا۔ کچھ بڑبڑائے بھی۔ دوسری بار ان کی آنکھوں میں نمی تھی اور بیٹے کا ہاتھ دباتے ہوئے گویا کہا

کہ وہ پریشان نہ ہو۔ تیسری دفعہ، جب وہ گھر کے قریب ایک سگنل پر رکے تھے، منیر صاحب نے جواب میں بیٹے کے کاندھے پر ہاتھ رکھا، گویا اسے تسلی دی ہو۔ شہر یار نے سوچا کہ اچھا ہے کہ ابا اپنی حالت کو سمجھنے ہی نہیں لگے، ہمت سے بھی کام لینے لگے ہیں۔ یہ سوچتے ہوئے شہر یار کو پوری طرح احساس تھا کہ ابا کی حالت ایسی نہیں کہ اسے وہ یا کوئی اور فوری طور پر سمجھ سکے۔ البتہ شہر یار کے لیے اس میں حیرت نہیں تھی کہ ابا اتنی جلدی ہمت سے کام لینے لگے ہیں۔ منیر صاحب کے سب جاننے والے، اس بات سے واقف تھے کہ وہ انتہائی برے حالات میں بھی خود پر قابو رکھتے تھے۔ کئی لوگ ان سے پوچھتے تھے کہ انھوں نے یہ وصف کیسے پیدا کیا۔ اس کے جواب میں وہ صرف مسکرادیا کرتے تھے۔ گزشتہ ماہ ایک اخبار کے انٹرویو میں پہلی مرتبہ انھوں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ یہ کوئی وصف نہیں ہے، بلکہ ایک عادت ہے۔ خاموش ہوجانے کی عادت۔ انھوں نے بس ایک کوشش کی ہے کہ اس خاموشی کو گہرا کرتے جائیں۔ خاموشی میں گہرائی؟ اس کے جواب میں وہ کچھ دیر چپ رہے، پھر بولے، اپنی اس تنہائی کو دل سے تسلیم کرلیں جس کا سامنا آدمی کو موت کے لمحے میں کرنا ہے اور جس سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، پھر خاموشی میں گہرائی خود بہ خود پیدا ہوجاتی ہے اور پھر بڑی بڑی باتیں بھی آدمی کو پریشان نہیں کرتیں، الٹا یہی باتیں زندگی اور زندگی کی حد میں آنے والی چیزوں کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ زندگی اور زندگی کی حد میں آنے والی کوئی بات اتنی بڑی نہیں، جتنی عام طور پر دکھائی دیتی ہے۔ یہ سب سوچ کر شہر یار کو اطمینان تو ہوا مگر وہ ابا کی اس حالت کو معمولی حالت قرار دینے کی ہمت خود میں نہیں پاتا تھا۔ وہ ماں کا سامنا کرنے اور انھیں ابا کی حالت سے متعلق بتانے سے ڈر رہا تھا، جس وقت وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔

شہر یار اور اس کی ماں صفیہ نے دوسروں کو منیر صاحب کی حالت کا ذکر کرنے سے پہلے اپنے فیملی ڈاکٹر سے مشورے کا فیصلہ کیا۔

میں آپ کو اتنا بتا سکتا ہوں کہ منیر صاحب کا ذہن بڑی حد تک ٹھیک کام کر رہا ہے۔ ان کے سب اعضا بھی درست کام کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نے کہا۔

پھر انھیں ہوا کیا ہے؟ شہر یار اور صفیہ نے بہ یک وقت پوچھا۔

ابھی صرف اندازہ ہے۔ حقیقت کا علم کئی طرح کے ٹیسٹوں کے بعد ہو سکے گا۔ اندازہ ہے کہ یہ Aphasia کا شکار ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نے منیر صاحب کی زبان کا معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

ماں بیٹے دونوں نے ڈاکٹر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

افیزیا کافی پیچیدہ امراض میں شامل ہے کیوں کہ اس کی علامات اور نوعیت ہر مریض کے یہاں مختلف ہوتی ہے۔ سادہ لفظوں میں یوں سمجھیے کہ اس میں دماغ اور زبان کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ منیر صاحب کا مرض بالکل ابتدائی سٹیج پر ہے۔ امید ہے جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔

آپ کے کہنے کا مطلب ہے کہ ابا کا ذہن صحیح کام کر رہا ہے، زبان نہیں۔ شہر یار بولا۔

یہی سمجھ لیجیے۔ وہ پہلے ہی کی طرح سوچ رہے ہیں، بس بیان نہیں کر پا رہے۔ ڈاکٹر بولا۔

کیا اب یہ کبھی ہم سے بات نہیں کر سکیں گے۔ صفیہ نے پریشانی سے ڈاکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کبھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ میں کسی اچھے نیورو سرجن سے وقت لیتا ہوں۔ ڈاکٹر نے تسلی دی۔

ڈاکٹر صاحب آپ افیزیا کے اس اچانک حملے کی وجہ بتا سکتے ہیں؟ شہر یار نے پوچھا۔

کئی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ عام وجہ تو دماغ کے بائیں حصے کا سٹروک ہے۔ (کچھ سوچتے

ہوئے) چند دن یا مہینوں یا سالوں پہلے انھیں سر کے بائیں حصے میں کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟ ڈاکٹر نے شہر یار اور صفیہ دونوں سے پوچھا۔

کوئی حادثہ نہیں ہوا۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے، تب سے انھیں جسم کے کسی حصے پر کوئی چوٹ نہیں لگی۔

منیر صاحب کی بیوی کے اس جواب میں ڈاکٹر کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا جیسے کوئی خاص بات کہنے والا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ بولا۔انسانی ذہن پیچیدہ ہی نہیں پراسرار اور جلد دھوکا کھانے والا بھی ہے۔ ہوسکتا ہے منیر صاحب کے لیفٹ ہمیسفیر نے سٹروک لگنے کا دھوکا کھایا ہو۔دھوکا تو میں کہہ رہا ہوں، ذہن کے لیے وہ حقیقت ہوتا ہے۔ذہن جس چیز کو حقیقت سمجھتا ہے، خواہ وہ ایک فرضی کہانی یا خیال ہی کیوں نہ ہو، اس کا اثر حقیقت کی مانند لیتا ہے۔لیکن یہ اس وقت معلوم ہو سکے گا جب منیر صاحب سے بات کر سکیں گے۔

منیر صاحب اس دوران میں ان تینوں کی طرف دیکھتے رہے۔ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ ان سب کو پہچان رہے تھے، شاید ان کی پریشانی اور اس کے سبب کو بھی سمجھ رہے ہیں۔ان کی آنکھوں میں بے چارگی اور تذبذب کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔انھوں نے ہاتھوں سے کچھ اشارے بھی کیے، جن کے بعد ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچا کہ منیر صاحب کے ذہن اور ان کی زبان (جس میں ان کی اشاراتی زبان بھی شامل ہے) میں بھی کوئی ربط باقی نہیں رہا۔ڈاکٹر نے جب انھیں سلام کیا اور ان کا حال دریافت کیا تھا تو وہ بڑ بڑائے تھے، ا،ا،اآ،آ،ا، ا،او،وو،ووو،ی، ی،آ آ، ا،ا،ا جیسی آوازیں تھیں جن کا کوئی مطلب یقیناً ہوگا مگر وہ تینوں وہ مطلب جو منیر صاحب کا تھا، یا کوئی بھی دوسرا، مطلب سمجھ نہ سکے۔وہ تینوں اور منیر صاحب کے جاننے والے اور پڑھنے سننے والے جانتے تھے کہ منیر صاحب کی زبان سے کبھی ایک لفظ بے معنی یا بے موقع ادا نہیں ہوتا۔انھیں سننے اور پڑھنے والا پہلا تاثر ہی یہ لیتا تھا کہ وہ کم، رچے تلے، حسب حال لفظوں میں

اپنی بات آسانی سے کہہ لیتے ہیں۔انھیں مناسب لفظ کی تلاش میں کہیں ایک پل کے لیے رکنا نہیں پڑتا تھا۔وہ کبھی ہکلائے نہیں تھے۔میرا مطلب ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں، وہ کیا کہتے ہیں جیسے الفاظ منیر صاحب کی گفتگو میں نہیں ہوا کرتے تھے۔یہ بات منیر صاحب کی بیوی، شہریار اور ڈاکٹر سے زیادہ وہ دوست بتا سکتے ہیں جن کے ساتھ وہ ہفتے میں کم از کم تین شامیں گزارتے تھے، اور جنھیں ابھی منیر صاحب کی حالت کا علم نہیں ہوا تھا۔وہ دوست اگر یہاں اس وقت ہوتے تو یہی بات کر رہے ہوتے۔منیر صاحب کے دوستوں کی ان باتوں کو (جو یہاں ہونی چاہییں تھیں مگر نہیں ہو سکیں) یاد کیے بغیر منیر صاحب کی زبان سے جو ابھی ابھی آوازیں برآمد ہوئی ہیں، ان کے سلسلے میں کوئی بات تک نہیں کی جا سکتی۔منیر صاحب کے یہ قریبی دوست جانتے تھے کہ انھیں یہ ہنر اس ریاضت کے نتیجے میں ملا ہے جسے وہ باقاعدگی سے جاری رکھتے ہیں۔وہ روزانہ کم از کم ایک گھنٹے کے لیے مکمل خاموشی میں ممکن حد تک گہرا مطالعہ کرتے ہیں۔ان کے یہی دوست جانتے تھے کہ منیر صاحب نے اسی ریاضت کے دوران میں دریافت کیا ہے کہ ہر آدمی دنیا سے، آس پاس سے، لوگوں سے، سیاست، مذہب سے، آرٹ سے اور خود سے جو تعلق قائم کرتا ہے، وہ اسی خاموش مطالعے کے دوران میں قائم ہوتا ہے۔جو لوگ مطالعہ نہیں کرتے یا کرتے ہیں تو سرسری کرتے ہیں، وہ دنیا اور خود سے سرسری سا رشتہ رکھتے ہیں، جیسے ہوا پتوں کو چھو کر گزر گئی ہو، کوئی نقش، کوئی نشانی، کوئی یاد اور کوئی زخم چھوڑے بغیر۔منیر صاحب کے دوست یہ بات بھی یاد کر رہے ہوتے کہ دنیا اور خود سے آدمی کے اس تعلق کے سارے راز اس زبان میں چھپے ہوتے ہیں، جسے کوئی شخص اپنی جذباتی حالتوں میں بولتا اور وجدانی حالتوں میں لکھتا ہے۔ایک مرتبہ منیر صاحب نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا (جسے ابھی منیر صاحب کی اس حالت کا علم نہیں ہوا) کہ آدمی جس زبان میں خود سے، راتوں کی تنہائی میں بات کرتا ہے، اگر وہ اس زبان سے مختلف ہو جسے وہ اپنے عام لوگوں سے بولنے اور لکھنے میں استعمال کرتا ہے تو اس پر اعتبار نہیں کرنا

چاہیے۔ ایسے شخص کو کوئی اہم عہدہ بھی نہیں ملنا چاہیے، اسے شوہر، استاد اور مصنف تو بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ منیر صاحب کے اس دوست نے، جنھوں نے ہوٹل کی پسندیدہ میز پر بیٹھے ابھی چائے ختم کی تھی اور سگریٹ سلگایا تھا، ہنستے ہوئے کہا آپ کا مطلب ہے کہ ساری لڑکیاں کنواری رہیں، بچے پڑھ نہ سکیں اور پبلشر بھوکے مر جائیں۔ منیر صاحب سنجیدہ ہو کر بولے: کنواری لڑکی، ان پڑھ شخص اور بھوکا پبلشر اتنا خطرناک نہیں، جتنا خطرناک وہ شخص ہے جو تنہائی میں چیختا ہو ....خود سے بات تک نہ کر سکتا ہو مگر لوگوں میں نرمی اور شائستگی سے دیر تک بات کرنے کا عادی ہو۔ یہ سن کر تینوں دوست، جو اس وقت ایک میز کے گرد بیٹھے تھے، خاموش ہو گئے تھے اور کچھ کچھ ڈر گئے تھے۔

ڈاکٹر، منیر صاحب کو شہر یار سے بھی زیادہ جاننے کا دعویٰ کرتے تھے، کیوں کہ وہ بھی کبھی کبھی ان کی شام کی نشستوں میں شریک ہوا کرتے تھے، خصوصاً کسی ویک اینڈ پر۔ انھوں نے جب منیر صاحب کو بڑبڑاتے (منیر صاحب کے لیے یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے ڈاکٹر کو اپنی کم علمی کا ندامت انگیز احساس ہوا) سنا تو سوچا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ منیر صاحب کے اپنے آپ اور دنیا کے ساتھ رشتے میں کوئی گڑبڑ تو پیدا نہیں ہو گئی ہے۔ انھیں شہر یار سے یہ پوچھنے کا خیال آیا کہ گزشتہ چند دنوں سے ان کا کوئی جھگڑا گھر میں یا دوستوں سے تو نہیں ہوا، یا انھیں کوئی دھمکی تو نہیں ملی مگر فوراً انھیں لگا کہ اس وقت یہ سوال بالکل نامناسب ہے۔ وہ تینوں منیر صاحب کی زبان سے ادا ہونے والی آوازوں کے سلسلے میں ایک دوسرے سے کوئی ایسی بات سننے کے منتظر تھے، جس سے انھیں وقتی ہی سہی، سطحی ہی سہی اور بے موقع ہی سہی، تسلی ہو۔ انھوں نے خود اپنے آپ کو اس تعطل کی حالت میں گھرا پایا تھا جس سے آثار قدیمہ کے ماہرین اس اوّلین لمحے میں گزرتے ہیں، جب وہ کسی نئی لوح کو ایک نئی زبان میں لکھا دریافت کرتے ہیں، مگر اسے سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں؛ اس لمحے وہ اپنی جانی پہچانی دنیا کو معطل پاتے ہیں۔ انھیں یہ تو یقین ہوتا

ہے کہ کسی نامعلوم تاریخی سچائی پر صدیوں سے پڑا پردہ اٹھ سکتا ہے، مگر انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ
یہ پردہ کب اٹھے گا، اس کے ساتھ ایک ڈر بھی کہیں نہ کہیں موجود ہوتا ہے کہ اُس لوح پر صدیوں
سے کندہ اور نظروں سے اوجھل، مردہ حالت میں موجود سچائیاں، آج کی، خود انھی کی کسی زندہ
حقیقت کو یکسر بدل سکتی ہیں یا کوئی خوف ناک پیش گوئی بھی کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوحوں
کی زبان، جب تک کہ پڑھ نہیں لی جاتی، پراسرار ہوتی ہے۔ منیر صاحب کے اچانک خاموش
ہو جانے سے اور اب فوری سمجھ میں نہ آنے والی آوازیں نکالنے سے پراسراریت کا ایک ہالہ،
جس میں خوف کی ایک چکر کھاتی موج کو محسوس کیا جا سکتا تھا، ان کے گرد پیدا ہو گیا تھا۔ ان کی
زبان سے ادا ہونے والی آوازوں کا مطلب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کھدائی سے برآمد ہونے والی
لوح کی کسی مردہ سچائی کی مانند، منیر صاحب کی یہ بے معنی آوازیں کسی بھی مطلب کو مسلط کرنے کی
ایک نیم طلسماتی طاقت اختیار کر گئی ہیں۔ اور یہ مطلب جس قدر خود منیر صاحب سے متعلق ہو سکتا
ہے، اسی قدر ان تینوں سے بھی اور ان سب سے بھی جو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں، جن سے
منیر صاحب نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے رشتہ قائم کر رکھا ہے! چند آوازیں کس زوردار انداز
میں ماضی، حال اور مستقبل پر بری طرح اثر انداز ہونے کی صلاحیت اختیار کر لیتی ہیں، یہ خیال کر
کے وہ تینوں ہیبت زدہ تھے۔ وہ تینوں جلد سے جلد اس تعطل کی حالت سے نکلنا چاہتے تھے، ایک
جھوٹی ہی سہی، تسلی کے منتظر تھے اور ماں بیٹے دونوں ڈاکٹر کی طرف نیم ملتجی نظروں سے دیکھ رہے
تھے۔ ڈاکٹر جس نے شہریار سے سوال پوچھنے کی خواہش کو ابھی ابھی دبایا تھا، اچانک بولا۔ تسلی کا
ایک پہلو یہ ہے کہ منیر صاحب کے بڑبڑانے (اس وقت بھی انھیں اس کے علاوہ کوئی لفظ انھیں نہیں
سوجھا) میں غصے، رنج، شکایت کا مفہوم ہے نہ شائبہ۔ یہ سن کر منیر صاحب کی بیوی نے اطمینان کا
ایک گہرا سانس لیا۔

منیر صاحب آوازیں سن سکتے ہیں، انھیں کتنا سمجھتے ہیں، یہ کہنا مشکل ہے، تاہم وہ ان

آوازوں کا کوئی نہ کوئی جواب دینے کا ارادہ بھی کرتے ہیں مگر اپنی بات اس زبان میں کہنے سے قاصر ہیں جسے بچپن سے آج شام تک وہ بولتے چلے آئے تھے۔اس سب کے باوجود وہ پریشان ہیں نہ ناراض اور یہ واقعی اطمینان کی بات ہے۔ڈاکٹر بولا۔

کیا وہ زبان بھول گئے ہیں؟ شہر یار نے ڈاکٹر سے دوبارہ پوچھا۔

کسی شے، آدمی یا چیز کا نام بھول جانا عام سی بات ہے۔ذہن میں کوئی خیال ہو، مگر اس کے لیے سیکھے گئے لفظ کا کسی خاص موقع پر یاد نہ آیا بھی معمول کی بات ہے، لیکن پوری زبان کا بھول جانا معمول کی بات نہیں۔جہاں تک میں جانتا ہوں افیزیا میں زبان ذہن سے ختم نہیں ہوتی۔ڈاکٹر نے سنجیدہ ہو کر کہا۔

اچانک ڈاکٹر کو ایک خیال سوجھا۔شہر یار کاغذ پنسل لاؤ۔دونوں منیر صاحب کے آگے ٹیبل پر رکھ دی گئیں۔منیر صاحب نے پنسل پکڑی، ان تینوں کی طرف باری باری دیکھا۔تینوں نے دیکھا کہ وہ کاغذ پر الٹی سیدھی لکیریں کھینچ رہے ہیں۔ان کے ہاتھ میں پنسل بڑبڑا رہی تھی۔

ڈاکٹر نے نیند کی گولیاں تجویز کیں اور رخصت ہوا۔

اگلی صبح دس بجے کے قریب وہ تینوں دوست دس پندرہ منٹ کے وقفے سے ان کے گھر پہنچے، جن کی کچھ باتیں ہم اوپر لکھ آئے ہیں، اس یقین کے ساتھ کہ وہ جتنا منیر صاحب کو جانتے ہیں، اتنا ہی ہم ان تینوں کو جانتے ہیں۔انھیں رات گئے شہر یار نے منیر صاحب کی حالت سے متعلق اطلاع دے دی تھی۔فرید اور محمود تو اسی وقت آنا چاہتے تھے مگر شہر یار نے اصرار کیا کہ وہ اگلی صبح آئیں۔جس وقت وہ منیر صاحب کے دوستوں کو فون کر رہے تھے، اسی وقت انھیں ڈاکٹر کی تجویز کردہ دوا دی جا رہی تھی۔

'ہم منیر صاحب کے ساتھ ان کی سٹڈی میں بیٹھیں گے'۔یہ فیصلہ تینوں نے منیر صاحب

کے پاس دو ایک منٹ بیٹھنے کے بعد کیا جو بیڈ سے ٹیک لگائے جماہیاں لے رہے تھے۔شہر یار کو اس فیصلے میں حکمت محسوس ہوئی، حالاں کہ تینوں نے اپنے فیصلے کا سبب بیان نہیں کیا۔

منیر صاحب، سلینگ کا لغت کہاں پڑا ہے؟ ایک لفظ یاد نہیں آ رہا، بی یا شاید ایم سے شروع ہوتا ہے۔فرید نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا جو ایک انگریزی اخبار میں لکھتے ہیں۔

تینوں دوست یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ منیر صاحب نے وہ لغت نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا۔فرید لغت کو الٹنے پلٹنے لگے۔

آج کل کون سی کتاب پڑھ رہیں منیر صاحب۔محمود نے پوچھا جو ایک شاعر ہیں، مگر زیادہ تاریخ کی کتابیں پڑھتے ہیں۔

منیر صاحب نے ان کے ایک آگے ایک کتاب لا کر رکھ دی جو سنسکرت کی ایک قدیم کتاب کا انگریزی ترجمہ تھا۔

تیسرے دوست نفیس کچھ کہتے کہتے رک گئے جو تصوف کی کتابیں شوق سے پڑھتے ہیں اور ایسی ہی کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ گزشتہ تیس سالوں سے کر رہے ہیں۔وہ منیر صاحب کے چہرے کو اس وقت غور سے دیکھتے رہے تھے، جب وہ باقی دو دوستوں کی فرمائشیں پوری کر رہے تھے۔یہ دیکھ کر ان کے دل کو دھکا سا لگا کہ منیر صاحب کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی جسے وہ ان کی ذہانت اور ذہنی دیانت داری کا اظہار کہتے تھے۔انھوں نے دل میں ایک تموج سا محسوس کیا اور ایک پل کے لیے آنکھیں بند کیں۔تھوڑی دیر بعد محمود کے ہاتھ میں موجود کتاب پر نگاہ کرتے ہوئے گویا ہوئے۔منیر صاحب کو ہر طرح کی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے۔

کوئی آدمی ہر طرح کی کتابیں نہیں پڑھ سکتا۔منیر صاحب بھی چار چھ قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں۔محمود نے تصحیح کی۔

ان میں تصوف کی کتابیں بھی شامل ہیں۔نفیس بولے۔

اور تاریخ کی بھی۔ محمود نے جواب دیا۔

جس نے تصوف کی ایک کتاب بھی اچھی پڑھ لی، اسے کوئی دوسری کتاب کیسے پسند آسکتی ہے؟ نفیس نے بات آگے بڑھانے کی خاطر کہا۔

اور جسے تصوف کا اصل مطلب سمجھ آگیا، اسے کوئی کتاب بھی کیسے اچھی لگ سکتی ہے، خواہ وہ تصوف ہی کی کیوں نہ ہو؟ محمود نے شوخی سے کہا۔

تصوف کتابوں سے تھوڑی سمجھ آتا ہے۔ علموں بس کریں اویار۔ فرید نے کتاب سے نظریں اٹھاتے ہوئے کہا۔ لیکن کچھ چیزیں بہ ہر حال کتابوں ہی سے سمجھ میں آتی ہیں۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ لغت میں کھو گئے۔

نفیس کو منیر صاحب کی تین دن پہلے کہی ہوئی بات یاد آئی، جو انھوں نے ان تینوں دوستوں کے ساتھ نشست میں کہی تھی کہ ایک زمانہ تھا کہ دانشوروں کو شکوہ تھا کہ لوگ سیاست، سماج، مذہب، ادب پر زیادہ بات نہیں کرتے، اور اب یہ شکایت ہے کہ زیادہ باتیں کرنے لگے ہیں۔ جب تک صرف خاص لوگ ہی سماج وسیاست پر گفتگو کرتے تھے، عوام اپنی ذاتی زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں خوش رہتے تھے۔ اب عوام بھی اپنی ذاتی زندگی کی خوشیوں اور غموں سے زیادہ خواص کی طرح بڑے بڑے مسائل پر بولنے لگے ہیں اور حقیقت میں دکھی ہیں۔ اس پر چاروں دوستوں میں گرما گرم بحث ہوئی تھی۔ فرید، نفیس، محمود تینوں نے منیر صاحب سے اختلاف کیا تھا اور عوام کے سیاسی شعور میں اضافے کو خوش آئند کہا تھا، مگر منیر صاحب اپنی بات پر قائم رہے۔ انھوں نے اپنی بات اس نکتے پر ختم کی کہ جہاں ایک مسئلے پر زیادہ بولنے والے ہوں، وہاں بولنا بے معنی ہو جاتا ہے اور بے معنی بولنے کا علم کچھ لوگوں کے چپ ہونے سے ہوتا ہے اور وہ اس وقت کے آنے سے ڈرتے ہیں جب انسان خود اپنے بارے میں بات کرنے کی اہلیت کھو دیں گے۔ اس پر باقی تینوں دوست چونک گئے تھے۔ نفیس نے یہ سب سوچتے ہوئے اپنے سر کو

جھٹکا۔ وہ ان باتوں اور منیر صاحب کی موجود حالت میں کسی تعلق کے خیال ہی سے ڈر گئے۔

مل گیا۔ فرید بچوں کی طرح چلائے۔

کیا مل گیا؟ شہریار نے پوچھا جو اسی وقت سٹڈی میں داخل ہوئے، اور ان کے پیچھے ملازمہ چائے کی ٹرالی لیے داخل ہوئیں۔

فرید نے اپنی دریافت کا انکشاف کرنے سے پہلے متجسس انداز میں منیر صاحب کی طرف دیکھا، جو انھی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ 'کل رات ہی سے ایک لفظ جو مجھے یاد نہیں آ رہا تھا، سخت پریشان کیے ہوئے تھا، منیر صاحب کے لغت میں بالآخر مل گیا ہے'۔ فرید نے جب بات مکمل کی تو منیر صاحب نے لمبا گہرا سانس کھینچا۔

صحیح کہا، جو موجود ہو، جس کی طلب بھی ہو، نہ ملے تو آدمی پریشان رہتا ہے، عاشقوں کی طرح راتوں کو جاگتا ہے۔ نفیس بولے۔

طلب صرف موجود کی ہوتی ہے۔ محمود، جنھیں ہر رائے کو چیلنج کرنے میں لطف آتا تھا، بولے۔

صحیح کہا، دنیا دار کو موجود ہی کو طلب ہوتی ہے۔ نفیس نے گویا حملے کو روکا۔

کیا تم اس بسکٹ کی طلب محسوس کر سکتے، اگر یہ یہاں اس وقت پلیٹ میں نہ ہوتا۔ محمود ہتھیار ڈالنے پر تیار نہیں تھے۔

دنیا دار، دنیا کو بسکٹ مطلب کھانے پینے، لذت انگیز اشیا سے آگے کہاں دیکھ سکتا ہے۔ ویسے تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جسے طلب کہتے ہیں، وہ اس بسکٹ کی اس وقت ہوتی، جب یہ موجود نہ ہوتا۔ نفیس نے کہا اور اس کے ساتھ اس نے فرید سے کہا کہ بھائی وہ لفظ تو بتاؤ جو تمھیں مل گیا ہے۔

پہلے میں وہ کیفیت بتاؤں گا جو اس لفظ کے یاد نہ آنے سے میری رات بھر رہی ہے۔فرید بولے۔

میں وہ کیفیت سمجھ سکتا ہوں۔محمود بولے۔ مجھے کبھی کبھی ایک مصرعہ لکھنے میں دو دن لگ جاتے ہیں، صرف وہ ایک لفظ نہیں ملتا جس کا دھندلا سا خیال ذہن میں ہوتا ہے۔لگتا ہے اس ایک لفظ کی تلاش دنیا کا سب سے اہم کام ہے۔

تم کسی دوسرے کی کوئی کیفیت نہیں سمجھ سکتے۔نفیس نے جرح کی۔

تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ کوئی شخص پوری طرح اپنی کیفیت بھی نہیں سمجھ سکتا۔محمود نے جواباً کہا۔

جب تک وہ اس کیفیت کے زیر اثر ہے، نہیں سمجھ سکتا، جب وہ گزر جائے تب سمجھ سکتا ہے۔نفیس نے دانشورانہ لہجہ اختیار کیا۔تم نے پڑھا ہوگا کہ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستان میں زندگی کے چار مراحل بیان کیے گئے تھے۔

وہ کیسے جناب کو یہاں اس وقت یاد آ گئے؟محمود نے کہا۔

پہلے سن لو پھر تمھیں اس سوال کا جواب خود بہ خود مل جائے گا۔ پہلا مرحلہ برہم چری کا جو بائیس چوبیس سال تک چلتا ہے۔اس عرصے میں آدمی کو ظاہری اور باطنی علوم پر دسترس حاصل کرنی چاہیے۔دوسرا مرحلہ گھر گرہست کا ہے۔عائلی زندگی گزارنی چاہیے۔جب بچوں کے بچے ہو جائیں تو بان پرستھ کا مرحلہ آتا ہے۔تب عورت اور مرد کو جنگل کی راہ لینی چاہیے اور غور و فکر میں وقت گزارنا چاہیے۔اس کے بعد آخری مرحلہ سنیاس کا ہے، تمام علائق دنیوی ترک کر دینے چاہئیں۔سنیاس وہی لے سکتا ہے، جس نے برہم چرج کا مرحلہ گزارا ہو۔نفیس نے وضاحت کی۔

تمھارا مطلب ہے کہ جب تک ہم کسی ایک حالت سے باہر نہیں آ جاتے، نہ اسے سمجھ

سکتے ہیں نہ دوسری حالت میں جا سکتے ہیں۔ محمود نے سوچتے ہوئے کہا۔ اس نے یہ کہتے ہوئے منیر صاحب کی طرف دیکھا جو انھی کی طرف متوجہ لگ رہے تھے۔

بھائی یہ سنیاس، جوگ، بیراگ ..... میرے پلے کبھی نہیں پڑے۔ فرید نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

سنیاس کے لیے جنگل، ویرانہ ضروری نہیں اور دنیوی علائق سے مراد صرف بیوی بچے، دولت، شہرت، گھر اور اس کی آسائشیں نہیں۔ یہ جو ہم اکٹھے بیٹھے ہیں یہ بھی علائق دنیوی ہیں۔ نفیس نے رک رک کر کہا، جیسے اسے یہ احساس ہو کہ وہ نہایت گہری بات کہہ رہا ہے اور اس کو سمجھنے والا کم از کم ایک شخص یہاں موجود ہے۔

کچھ دیر کے لیے سب کو چپ سی لگ گئی۔

منیر صاحب کی سٹڈی میں موجود سب لوگوں نے ایک ساتھ محسوس کیا کہ ان کا سامنا معمول کی صورتِ حال سے ہٹ کر ہے۔ یہ صورتِ حال خال خال زندگی میں آتی ہے، جب آدمی کو لگتا ہے کہ اسے وقت پر اختیار حاصل ہو گیا ہے، اور اس لمحے وہ یقین کرنے لگتا ہے کہ واقعات کا رخ اپنی منشا کے مطابق موڑا جا سکتا ہے۔ خود انھیں وہیں بیٹھے بیٹھے ادراک ہوا کہ وقت پر اختیار کے سلسلے میں ان کے مبہم سے ارادے کا دخل ضرور تھا، مگر حقیقت میں وہ اپنی روحوں سے ایک دعائیہ موج اٹھتی محسوس کر رہے تھے جو اس جگہ کے ماحول کو نئے سرے سے ترتیب دے رہی تھی۔ صورتِ حال کا نیا پن انھیں اس جانب دھیان دینے سے باز رکھے ہوئے تھا کہ وقت پر اختیار کے بشری یقین کا منبع خود وقت نہیں ہے، بلکہ وقت سے متعلق آدمی کے آرزومندانہ خیالات ہیں۔ چوں کہ وقت اپنے متعلق آدمی کی خوش گمانیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا، اس لیے کچھ ہی دنوں بعد منیر صاحب کی سٹڈی میں بیٹھے سب لوگوں کو احساس ہو گیا کہ وہ اپنے دوست کی محبت میں اپنی حد اور بساط سے بہت آگے چلے گئے تھے۔ لیکن جس لمحے کا بیان اس مقام پر کیا

جا رہا ہے وہاں، اس لمحے وہ اپنی حد اور بساط کو فراموش کیے ہوئے تھے۔

بھئی فرید صاحب اپنی کیفیت بیان کیجئے۔ بات سے بات نکلی تو کہاں چلی گئی۔ نفیس نے کہا۔

فرید نے آنکھیں بند کیں اور گویا ہوا۔

مطلوب لفظ کے یاد نہ آنے کی کیفیت کچھ ایسی ہوتی ہے، جیسے آپ کو کسی جگہ پہنچنا ہو، آپ جیسے ہی گھر سے نکلنے لگیں اور گاڑی کی چابی نہ ملے۔ فوری پہنچنے کے ارادے کا لمحہ بہ لمحہ ٹوٹنا اور جڑنا، گھر کی ہر شے کو الٹ پلٹ دینا، اس وقت کی ایک ایک بات کو یاد کرنا، جب آپ نے وہ چابی کہیں رکھی تھی، اس یقین کے ساتھ کہ کوئی چیز دوسری چیزوں سے الگ نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ گھر میں پڑی ایک عام سی چابی بھی، گھر کی سب بڑی چیزوں سے جڑ جاتی ہے، یہ اور بات ہے کہ ہمیں اس کا احساس اس وقت ہوتا ہے، جب چابی کھو جاتی ہے۔ چابی کھونے کا تجربہ، لفظ کے کھو جانے سے مختلف نہیں۔ تب آپ کو لگتا ہے کہ وہ لفظ کتنے اور لفظوں سے جڑا تھا۔ آپ ان سب لفظوں کو یاد کرتے ہیں جو اس لفظ سے کوئی بھی رشتہ رکھتے ہیں۔ ان چیزوں کو یاد کرتے ہیں، جن کا ذکر کبھی بھی اس ایک لفظ کے ساتھ تھا یا ہو سکتا تھا مگر آپ کو اسے جاننے کا موقع نہیں ملا۔ وہ کھویا ہوا لفظ، اچانک اس سب سے جڑ جاتا ہے جو آپ کے ذہن میں کسی بھی صورت میں موجود ہے۔ آپ پورے ذہن کو الٹ پلٹ کے دیکھتے ہیں، جیسے چابی کے لیے سب درازوں کو، الماریوں کو، میز پر پڑی سب کتابوں، اخباروں کو، اپنے کپڑوں کی سب جیبوں کو، ویلٹ کو، ہینڈ کیچرز کو، شیشے کو ویس کو، سب کونے کھدروں کو، گویا کوئی شے ایسی نہیں جہاں چابی کے نہ ہونے کا امکان نہ ہو، ایسے ہی اس کھوئے ہوئے ایک لفظ کے لیے بھی آپ کو یقین ہوتا ہے کہ ذہن میں کوئی یاد، کسی شے کی یاد، کوئی خیال، کسی بات کا خیال ایسا نہیں، جس کا تعلق اس لفظ سے نہ ہو۔ کبھی وہ لفظ یاد آ جاتا ہے، کبھی نہیں۔ مجھے رات بھر وہ لفظ یاد نہیں آیا۔ اس سے متعلق سب یاد آیا،

مگر وہ نہیں۔ خواب میں بھی میں نے خود کو گھر میں چلتے اور کوئی شے ڈھونڈتے ہوئے پایا۔ شکر ہے وہ مجھے یہاں منیر صاحب کی لغت میں مل گیا۔ یہ کہتے ہوئے فرید نے منیر صاحب کی طرف غور سے دیکھا، اور ان کے چہرے پر ایک جانا پہچانا تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر کہ منیر صاحب ذرا سا مسکرائے، سب مسکرا دیے۔

اب وہ لفظ تو بتا دیجیے جس کے لیے آپ نے یہ الف لیلہ سنائی۔

وہ لفظ تھا: بمبو۔

تم بمبو کے لیے پریشان تھے؟ نفیس کے لہجے میں تمسخر تھا۔

جی ہاں، اور یہ پہلی بار نہیں، کوئی بیسیوں دفعہ ہو چکا ہے کہ میرا ذہن ان سب لفظوں کے لیے اپنے سارے جہان کو چھان مارتا ہے۔ اس کے لیے کوئی لفظ معمولی ہے نہ حقیر۔ فرید نے نفیس کے تمسخر پر توجہ نہیں دی۔ انسانی ذہن، انسانی زندگی کی مانند ہے۔ سب چیزیں ایک دوسری سے جڑی ہیں، چھوٹی بڑی، حقیر عظیم۔ سب ایک زنجیر میں۔ ایک کڑی ٹوٹتی ہے تو پوری زنجیر ہل جاتی ہے۔

سب پر خاموشی طاری ہوگئی۔ سب کی روحوں سے اٹھنے والی موج کسی نئی ترتیب کی آرزو میں سٹڈی کے ماحول میں چکرا رہی تھی۔ کئی لمحے گزر گئے۔ منیر صاحب بے چین محسوس ہوئے۔ وہ جب سے سٹڈی میں آئے تھے، اپنے بیڈ پر نیم دراز تھے۔ اب وہ اٹھ بیٹھے تھے۔ شہر یار نے انھیں پانی کا گلاس دیا۔ پانی کے دو گھونٹ بھرنے کے بعد انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نفیس کرسی سے اٹھا۔ لکھنے کی میز سے پنسل اٹھائی اور منیر صاحب کو پیش کی۔ انھوں نے تشکر سے نفیس کو دیکھا۔ اسی دوران میں شہر یار نے میز سے رائٹنگ پیڈ اٹھایا اور منیر صاحب کو گود میں رکھ دیا۔ سب کی نظریں منیر صاحب کی انگلیوں کی طرف تھیں۔ کافی دیر کی جدوجہد کے بعد وہ محض ایک لفظ لکھنے میں کامیاب ہوئے، جسے ان چاروں نے

مختلف طرح سے پڑھا اور کسی کو دعویٰ نہیں تھا کہ اس نے ٹھیک پڑھا ہے۔

منیر صاحب کے وہ تینوں دوست پہلے چند دن باقاعدگی سے آتے رہے۔ پھر وقفوں سے آنے لگے۔ پھر کبھی کبھار۔ سب کو اکٹھے آئے ہوئے بھی اب ایک ماہ ہو چلا تھا۔ شروع میں ان تینوں دوستوں کا ایک انوکھا خیال تھا کہ منیر صاحب کی بیماری کا سبب اور علاج ان کی سٹڈی ہی میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ وہ جو کچھ پڑھتے، لکھتے اور بولتے ہیں، اسی میں کچھ کھو سا گیا ہے۔ وہ اپنی باتوں سے انھیں اس کھوئی گئی چیز کو ڈھونڈنے میں مدد دینا چاہتے تھے۔ پہلے دن کی لمبی اور خاص رخ پر بات چیت اسی انوکھے خیال کے تحت تھی۔ ایک اور خیال بھی ان تینوں دوستوں کے ذہن میں تھا (جو منیر صاحب کی موجودگی میں ہونے والی مستقل بحثوں کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا) کہ دنیا کے ہر شخص کو جو بھی بیماری لاحق ہوتی ہے، اس کا سبب اور علاج اس کے محبوب ترین مشغلے میں تلاش کرنا چاہیے۔ لیکن ایک بات ان تینوں دوستوں کے ذہن میں، ان کے دلی اخلاص کے باوجود نہ آسکی کہ کوئی شخص اپنے محبوب ترین مشغلے کے بارے میں ہمیشہ ایک جیسے احساسات نہیں رکھتا۔ چوں کہ یہ بات ان کے ذہن میں نہ آسکی اس لیے یہ بات بھی ان سے اوجھل رہی کہ محبوب ترین مشغلے سے متعلق احساس کی تبدیلی، اس پوری دنیا کو مٹی کا ڈھیر بنا سکتی ہے جسے آدمی نے ایک عمر کی محنت سے اپنے دل، ذہن، بات چیت اور لکھنے لکھانے میں قائم کیا ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی نہ سوچ سکے کہ اس دنیا میں وہ تینوں دوست بھی شامل ہیں۔ حالاں کہ انھوں نے یہ بات اچھی طرح مشاہدہ کی تھی کہ منیر صاحب کا چہرہ مسلسل مرجھاتا جا رہا ہے اور آنکھوں میں تھکن اور بے زاری بڑھتی جا رہی ہے اور اسی بنا پر انھوں نے آنا کم کر دیا اور ایک دوسرے کو بتائے بغیر منیر صاحب کو تینوں نے اپنی طرف سے خدا کے سپرد کر دیا۔ البتہ منیر صاحب کے جاننے والے، انھیں پڑھنے والے، کچھ رسالوں کے مدیر اور ان کے پبلشر ان

کی خیریت معلوم کرتے رہے۔

صفیہ مسلسل ان کی نگہداشت میں مصروف رہی۔ وہ شروع کے چند دنوں میں گھنٹوں ان کے پاس چپ بیٹھی رہتی۔ انھیں دیکھتی رہتی۔ ان کی آنکھوں کی جنبش سے ان کی ضرورت کو سمجھنے لگی تھی۔ شوہر کی ضرورتوں کا خیال رکھنے کے دوران میں اسے کچھ نئی چیزیں جاننے اور سیکھنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔ جب اس کی دو پرانی سہیلیوں نے اس سے کہا کہ وہ اب ان سے کم ملتی ہے اور فون بھی بہت کم کرتی ہے تو اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ پہلے وہ بور ہوتی تھی، اب نہیں۔ اسے افیزیا وغیرہ سمجھ نہیں آیا تھا مگر وہ منیر صاحب کے چہرے اور آنکھوں کے اشاروں کو سمجھنے کے بعد محسوس کرنے لگی تھی کہ جیتے جاگتے انسان سے نہ تو زبان چھینی جاسکتی ہے اور نہ وہ دوسروں تک اپنی بات پہنچانے سے کسی ذی روح کو روکا جاسکتا ہے۔ جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ منیر صاحب اس کی باتیں سمجھ لیتے ہیں تو اسے ایک انوکھا خیال سوجھا اور اس نے محسوس کیا کہ اس میں اس کی خود غرضی بھی شامل ہے اور ایک دیرینہ آرزو بھی۔ اس نے شادی کے ابتدائی دنوں کے قصے پوری تفصیل کے ساتھ چھیڑنے شروع کیے۔ اس نے دیکھا کہ منیر صاحب کی آنکھوں میں نئی چمک پیدا ہونے لگی ہے اور ان کے چہرے پر تازگی آتی جارہی ہے۔ کچھ باتیں کہتے ہوئے وہ شرما جاتی، مگر دل میں ایک مسرت کے ایک نادریافت چشمے کو پھوٹتے محسوس کرتی۔ اسی دوران میں وہ جب منیر صاحب کی طرف دیکھتی تو ان کی آنکھوں میں شرارت ہوتی اور تقاضا بھی کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ کچھ دنوں بعد اچانک اس نے وہ باتیں ختم کردیں۔ پہلے چند ہفتوں کے بعد کی جو باتیں اسے یاد آئیں ان کے ساتھ ملال کی ایک کیفیت تھی۔ وہ پھر ان کے پاس چپ بیٹھنے لگی۔

ایک دن منیر صاحب نے ایک کتاب کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئی۔ اب وہ کچھ دیر رشتہ داروں کی باتیں کرتی اور زیادہ دیر وہ کتاب انھیں پڑھ کر سناتی۔ اسی دوران میں ایک

چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ منیر صاحب کے سکول کے زمانے کے ایک کلاس فیلو ان کی مزاج پرسی کے لیے آئے۔ پہلے ملازمت کرتے تھے، پھر اپنا کاروبار شروع کیا۔ کئی عمرے اور حج کر چکے تھے۔ سر پر سبز پگڑی اور چہرے پر سفید ڈاڑھی تھی۔ اتفاق سے وہ اس وقت آئے، جب منیر صاحب اپنی بیوی سے کتاب سن رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ضبط کیے بیٹھے رہے، پھر بول پڑے۔ بھابھی، آپ انھیں مذہبی کتابیں سنایا کریں۔ دیکھیے گا، کتنی جلدی ٹھیک ہوتے ہیں۔ اللہ کے کلام میں بہت شفا ہے۔ اپنی کاروباری کامیابیوں کا طولانی قصہ سنایا۔ اپنی بات اس پر ختم کی کہ جس وقت سے انھوں نے اپنی دکان پر نماز کے اوقات کے وقفے اور غیر مسلموں کے داخلے کے بند ہونے کا اشتہار لگایا اور کلمہ طیبہ نمایاں طور پر آویزاں کیا، تب سے ان کی دکان بہت چل رہی ہے۔ منیر صاحب کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر واش روم چلے گئے۔ صفیہ خاموش رہی۔ اس واقعے کے بعد منیر صاحب اپنی بیوی اور بیٹے کو کسی طرح یہ سمجھانے میں کامیاب ہو گئے کہ ان سے پہلے پوچھ لیا جائے کہ وہ کس سے ملنا چاہتے ہیں اور کس سے نہیں۔

شہر یار نے منیر صاحب کو شہر کے اس مشہور نیورالوجسٹ کو بھی دکھایا جس سے ان کے فیملی ڈاکٹر نے وقت لیا تھا۔ اس نے بھی مسکن دوائیں تجویز کیں اور انتظار کرنے کا کہا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ منیر صاحب کی یادداشت ٹھیک کام کرتی تھی۔ شہر یار نے وہ سب تبصرے منیر صاحب سے چھپائے جو اخبارات میں ان کی زبان بند ہو جانے کے بعد چھپے یا کچھ ٹی وی شوز میں ہوئے۔ کسی نے لکھا کہ حکومت کے خوف سے ان کی زبان بند ہوئی ہے۔ کسی نے پشیمانی، کسی نے ضمیر کے بوجھ کو منیر صاحب کی زبان کے بند ہونے کا سبب قرار دیا تھا۔ کچھ نے منیر صاحب پر باہر کی طاقتوں کی زبان بولنے کا الزام لگایا جن کے خلاف نئی متوقع حکومت اقدام کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ جب اپنی قوم کی بجائے، دوسروں کی زبان بولیں گے تو زبان تو بند ہوگی۔ زبان بندی حکومت کرے، ضمیر کا بوجھ کرے یا خدا، ایک ہی بات ہے۔ شہر یار نے

اخبارات کے مدیروں کو فون کر کے شکایت کی مگر انھوں نے کہا کہ وہ کسی کی زبان کیسے بند کر سکتے ہیں۔

تقریباً چھ ماہ بعد۔ صفیہ لائبریری سے کتاب اٹھا لائی۔ وہ کئی دنوں سے اس کتاب کو منیر صاحب کے لکھنے کی میز پر دیکھ رہی تھی۔ اسے پڑھنے کے لیے کھولا تو اس میں سے ایک کاغذ نیچے گرا۔ یہ لکھائی تو آپ کی لگ رہی ہے۔ منیر صاحب کے سامنے کرسی پر بیٹھے، اپنی نظر کی عینک درست کرتے ہوئے صفیہ نے کہا۔ پھر بلند آواز میں پڑھنے لگی۔

اس نے تین تاروں والے ستار کا خواب دیکھا تھا۔ ایک تار ڈھیلا تھا، جس سے کوئی آواز نہیں نکلتی تھی۔ دوسرا تار اس قدر کسا ہوا تھا کہ وہ انگلی کو زخمی کرتا تھا، کوئی آواز پیدا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ تیسرا تار ایک حد تک کسا ہوا اور قدرے ڈھیلا تھا۔ دنیا کی سب سے شیریں آوازیں اس تار کو چھیڑنے سے پیدا ہوتی تھیں۔ وہ اس ستار کے چوتھے تار کا ذکر بھول گیا یا شاید اس کی نگاہ اس پر نہیں پڑی، حالاں کہ وہ صاحب نظر تھا۔ اسے چھیڑنے سے خاموشی کا سر پیدا ہوتا ہے جسے صرف وہی شخص سن سکتا ہے، جس نے تیسرے تار کی سب آوازیں سن لی ہوں اور اسے کوئی شک نہ رہا ہو کہ آوازیں خود کو دہراتی ہیں اور روح کو کچل دینے والے کھوکھلے پن کو جنم دیتی ہیں!

یہ پہلے کا لکھا ہوا ہے یا اب لکھا ہے؟
صفیہ کے اس سوال پر منیر صاحب بس مسکرا دیے۔

''ان کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ جب تک غار میں رہے، کسی سے نہیں ملے۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے عمر کے بائیس سال غار سے باہر کی دنیا میں گزارے تھے، اس کی یادداشت میں کسی کو خلل انداز نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ کہتے تھے یادداشت اگر بے خلل رہے تو معجزے دکھا سکتی ہے۔ ان کی تصویر کو دیکھنے والے اس بات پر فوراً یقین کر لیتے تھے۔ یہ بھی مشہور تھا کہ جیسے ہی انھوں نے تصویر مکمل کی، دونوں غار سے غائب ہو گئے۔ اس کہانی میں یقین کرنے والوں میں ایک گروہ کا خیال تھا کہ جیسے جیسے وہ تصویر مکمل کرتے، ان کے جسم تصویر میں تحلیل ہوتے جاتے۔ ادھر تصویر مکمل ہوئی، ادھر وہ دونوں غائب ہو گئے۔ دوسرے گروہ کا ماننا تھا کہ وہ کسی اور دنیا سے آئے تھے، صرف ایک مقصد کی خاطر، اس لیے جیسے ہی تصویر مکمل ہوئی، وہ واپس چلے گئے''۔

''ایک مصور نے بتایا کہ وہ ایک مقدس تصویر کی نقل کو دنیا کا سب سے بڑا پاپ سمجھتا ہے تو سب کے ماتھے ٹھنکے۔ اس مصور کا یہ بھی خیال تھا کہ انسانی تخیل الوہی تصویر کی نقل کر ہی نہیں سکتا۔ الوہی تخیل کس طرح کام کرتا ہے اور اس کی حدیں کہاں کہاں ہیں یا سرے سے حدوں سے ماورا ہے، اسے انسانی عقل سمجھ سکتی ہے نہ انسانی تخیل۔ کچھ مورکھ یہ بات نہیں سمجھتے، اس لیے وہ الوہی تخیل کی نقل کی کوشش کرتے ہیں، جس کی سزا انھیں بھگتنا پڑتی ہے۔ وہ پہلے وحشت پھر جنون کا شکار ہوتے ہیں۔ اس نے یہ خیال بھی ظاہر کیا کہ جتنے لوگ وحشت اور جنون میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کی وجہ لازماً الوہی مملکت میں جانے کی جسارت ہوتی ہے''۔

''اسے شہر میں قیام کی اجازت اس شرط پر ملی تھی کہ وہ اس دیوار پر کچھ نہ کچھ لکھے گا۔ اس نے پہلے سوچا کہ وہ اندھوں اور گونگوں کے شہروں کا مختصر احوال لکھے گا۔ پھر کچھ سوچ کر اتنا لکھا: لکھنا بھی سزا ہے، پر کسی بادشاہ کے شہر میں آدمی ہونے کی سزا اس سے بڑھ کر ہے''۔

(کتاب میں شامل افسانوں سے اقتباسات)

مصنف کے بارے میں: ڈاکٹر ناصر عباس نیر عہدِ حاضر کے ممتاز نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ وہ اردو میں مابعد نوآبادیاتی مطالعات کے بنیاد گزار ہیں۔ ان کی تنقیدی کتب میں 'جدید اور مابعد جدید تنقید'، 'لسانیات اور تنقید'، 'متن سیاق اور تناظر'، 'مجید امجد: حیات، شعریات اور جمالیات'، 'مابعد نوآبادیات: اردو کے تناظر میں'، 'ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری'، 'اردو ادب کی تشکیل جدید'، 'اُس کو اِک شخص سمجھنا تو مناسب ہی نہیں'، 'نظم کیسے پڑھیں' اور دیگر کتب شامل ہیں۔ 'راکھ سے لکھی گئی کتاب' سے پہلے ان کے دو افسانوی مجموعے 'خاک کی مہک' اور 'فرشتہ نہیں آیا' شایع ہوئے ہیں۔ وہ متعدد قومی و عالمی کانفرنسوں میں مقالات پیش کر چکے ہیں۔ وہ پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہے اور آج کل اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

سرورق: قدوس مرزا

Rs. 600.00

www.sangemeel.com
ISBN-10: 969-35-3165-5
ISBN-13: 978-969-35-3165-7
9789693531657